TIGHT BINDING BOOK

UNIVERSAL
LIBRARY
OU_222125
UNIVERSAL
LIBRARY

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No. ۸۹۱۵۶۴۳۳ Accession No. ۱۳۵۱۰ 13510.

Author ا - ب بلاکاری

Title ایکٹرس کی آپ بیتی

This book should be returned on or before the date last marked below.

جملہ حقوق بحق پبلشرز محفوظ ہیں

بڑی مشکل سے رکھا تھا چھپائے اس کو پہلو میں
چھپائے سے نہیں چھپتا ہے اب سوزِ نہاں ہمسے

ایکٹرس کی آپ بیتی

از

مس بملا کماری

پبلشرز

نرائن دت سہگل اینڈ سنز تاجران کتب لوہاری گیٹ

لاہور

۱۳۵۱۰

۳۲۳

مرکنٹائل پریس لاہور میں چھپا اور نرائن دت سہگل پرنٹر و پبلشر نے لوہاری
گیٹ لاہور سے شائع کیا

بار سوئم　　ایک ہزار　　قیمت عہ

ایکٹرس کی آپ بیتی

پہلا پیار

میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد جب میں نے اپنا نام کالج میں درج کرایا تو دل میں ایک گدگدی سی پیدا ہونے لگی۔ نہ جانے دل میں کیا آزار سا ہو گیا تھا۔ جماعت میں میرے ساتھ جو لڑکیاں پڑھتی تھیں۔ ان میں چند ایک شادی شدہ تھیں وہ جب اپنے شوہروں کی محبت کا ذکر کرنے لگتی تھیں تو میں اپنے مستقبل میں ہونے والے شوہر کے محض تصور سے ہی دل میں خوشی محسوس کرنے لگتی تھی۔ کسی حسین نوجوان کا مسکراتا ہوا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے آ کر ناچنے لگتا۔ وہ کیسا ہوگا؟ خوبصورت۔ تعلیم یافتہ اور دل سے محبت کرنے والا!۔

کالج سے نکلنے پر میں دیکھتی۔ لوگوں کا ہجوم لڑکیوں کی انتظار میں کھڑا رہتا۔ ان میں کچھ لوگ تو اپنی بہن بیٹیوں کو لیجانے کے لئے آتے تھے اور کچھ صرف آنکھیں سینکنے کیلئے اس کا احساس مجھے کچھ ہی مہینوں میں ہونے لگا کیونکہ بھیڑ سے بدن کے ایک نوجوان کو میں ہر روز بلاناغہ کالج کے دروازے سے تھوڑے فاصلہ پر کھڑا ہوا دیکھتی تھی وہ مجھے دیکھتا میں اسے دیکھتی۔ ہم دونوں کی چار آنکھیں ہوتیں۔ اس کے ہونٹ کچھ کہتے میرے کان

کچھ سنتے آنکھیں کچھ دیکھتیں۔ مگر بولتا کوئی کچھ نہ تھا لڑکیوں کے گروہ کے گروہ رنگ برنگی ساڑھیوں میں ملبوس تتلیوں کی طرح کالج سے نکلتے اور سڑک پر بکھر جاتے۔ پورے ایک سو بیس دن تک میں نے اس نوجوان کو اپنی انتظار میں کھڑے پایا۔ پانی برس رہا ہے سڑکوں پر گھٹنوں تک پانی ہی پانی ہو گیا ہے۔ مگر وہ برساتی پہنے فٹ پاتھ پر کالج کی چھٹی ہونے کی انتظار میں کھڑا ہے۔

چندرا نے ایک دن کالج آتے ہی کہا "آجکل بہت بن ٹھن کر آتی ہو۔ دیکھو کہیں کوئی نیم بسمل نہ ہو جائے؟"

"دھت پگلی" کہہ کر میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس نے ہاتھ کو ہٹاتے ہوئے کہا۔ وہ ہے تو حسین مگر ذرا ......!

"وہ کون؟" میں نے پوچھا۔

"آہا! ایسے بن رہی ہو جیسے کچھ جانتی ہی نہیں۔ اجی یہاں تو

؎ خط کا مضمون بھانپ لیتے ہیں لفافہ دیکھ کر

"مگر کچھ کہو بھی؟"

اسے کہوں کیا؟ وہ جو میاں مجنوں روزانہ اس موڑ پر کھڑے رہتے ہیں تمہارے لئے ہی برسات اور گرمی کی تکلیف برداشت کر رہے ہیں۔"

"میں اس کا مطلب نہیں سمجھی؟"

"اچھا ہے جو مطلب نہیں سمجھیں۔ اگر مطلب سمجھنے لگو گی تو تباہ ہو جاؤ گی۔ دو سال پیشتر اسی کالج میں ایک ایسا واقعہ ہو گیا تھا۔ اسلئے میں تمہیں آگاہ کر دینا چاہتی ہوں۔"

میں سن رہ گئی۔ میرا خیال تھا کہ شاید میرے اس راز محبت کو کوئی نہیں جانتا۔ مگر میرا یہ بھرم چندرا نے دور کر دیا۔ چندرا عمر میں مجھ سے تین سال بڑی تھی۔ وہ شادی شدہ تھی۔ بڑی ہنس مکھ لڑکی تھی۔ محبت کی تو ایسی ایسی باتیں سنانی تھی۔ کہ جماعت

کی سب لڑکیاں اس کی باتیں سننے کے لئے بے چین رہتی تھیں۔ کالج کا واقعہ جاننے کے لئے میں بے تاب ہو اٹھی۔ میں نے پوچھا "بہن چندرا! کیا ہوا تھا کالج میں۔

"جوش جوانی میں جو کچھ ہو سکتا ہے۔ وہی ہوا تھا"

"کہہ بھی! کیا ہوا تھا؟"

"اجی ہوا کیا تھا؟ ایک لڑکی فرسٹ ایئر میں داخل ہوئی تھی۔ عالم شباب میں اس نے ابھی قدم ہی رکھا تھا۔ دیکھنے میں بھی اچھی تھی۔ بن ٹھن کر بعینہٖ تمہاری طرح آیا کرتی تھی۔ ایک نوجوان بعینہٖ تمہارے اس مجنوں کی طرح روزانہ اسے دیکھنے کے لئے آیا کرتا تھا۔ لوگوں نے اسے ایک دو دن نہیں۔ بلکہ مہینوں اسی طرح کھڑے دیکھا تھا۔ ایک دن نہ جانے وہ شراب پی کر آیا تھا۔ یا خدا جانے کیا بات تھی۔ اس نے اس لڑکی کو چھیڑ دیا۔ لڑکی بگڑ اٹھی۔ اس پر اس نے سر بازار اس کا بوسہ لے لیا۔ سینکڑوں لڑکیوں میں اس کو اس طرح بوسہ لیتے دیکھ کر کچھ لوگ اس پر ٹوٹ پڑے اور اس کی خوب مرمت کی۔ اس نوجوان کی مرمت تو ہوئی مگر اس لڑکی کا کالج میں منہ دکھلانا مشکل ہو گیا۔ اس کے بعد وہ کالج میں نہیں آئی۔ تمہارے رنگ ڈھنگ بھی کچھ ایسے ہی نظر آ رہے ہیں۔ اس لئے تمہیں آگاہ کر دیا ہے۔ برا تمہیں ضرور لگیگا مگر کھری بات کہہ دینے کی میری عادت ہے۔ اس لئے میں اپنی عادت سے مجبور ہوں"

اس واقعہ کی بات سن کر میں دنگ رہ گئی کسی نوجوان کو اتنی جرأت ہو سکتی ہے یہ میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ ایک ہی لمحہ میں میرے دماغ میں یہ بات سما گئی کہ کہیں یہ نوجوان بھی اسی نوجوان کی مانند مجھے سر بازار چوم لے تو؟ مستقبل کے کسی نامعلوم شک سے میں کانپ اٹھی۔ میں نے پوچھا "چندرا! اس بیچاری لڑکی کی شادی ہو گئی

کہ نہیں "

چندرا نے رعب دکھاتے ہوئے کہا " گھر میں پیسہ تھا۔ اس سے تمام باتوں پر پردہ پڑ گیا۔ ورنہ کوئی اس کے ساتھ شادی کرنے کیلئے بھی تیار نہ ہوتا۔ میرے پڑوس میں ہی اس کا مکان ہے۔ کبھی کبھی میرے یہاں آیا کرتی ہے میری اس سے باتیں ہوتی ہیں بیچاری سب کچھ بتلا دیتی ہے۔

اس لڑکی کے متعلق نہ جاننے میں کیوں زیادہ سے زیادہ جاننے کے لئے بیتاب ہو اٹھی۔ اس روز پہلا گھنٹہ ہم دونوں کا خالی تھا کیونکہ پروفیسر صاحب کسی کام کی وجہ سے اس روز تشریف نہیں لائے تھے۔ انہیں دمہ کی شکایت بھی تھی۔ اس سے پہلے میں دس روز تودہ جماعت لیتے ہی نہ تھے۔ میں نے بات چیت کا سلسلہ جاری رکھنے کیلئے چندرا سے دوبارہ پوچھا " کیوں بہن چندرا! وہ اپنے شوہر کی تو بہت تعریف کرتی ہوگی "

" واہ! یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ کوئی عورت اپنے شوہر کی برائی کرتی ہے؟ میرے پڑوسی کنہائی لال سرکار مہینہ میں دو چار مرتبہ اپنی بیوی کی مرمت کر ہی ڈالتے ہیں۔ مگر ان کی بیوی اپنے شوہر جیسا بھولا بھالا اور کسی کو نہیں سمجھتی۔ نلنی کا بھی یہی حال ہے۔ نلنی جیسا میرا شوہر ہو تو گنگا میں ڈوب کر مر جاؤں "

" نلنی کون؟ "

" ارے! سب رامائن پڑھ گئی مگر ابھی تک یہ بھی نہیں جانا کہ رام راکھشس تھا کہ راون راکھشس تھا۔ ابھی نلنی کی ہی تو تمام باتیں میں نے تمہارے گوش گذار کی ہیں "

" اچھا ہمارے کالج کی وہی لڑکی! "

جی ہاں! اب سمجھی "

" تو وہ اپنے شوہر کے متعلق کیا کہتی تھی؟ "

چندرا کچھ کہنا ہی چاہتی تھی۔ کہ گھنٹہ بج گیا! اور ہم لوگوں کو مجبوراً اپنی بات

ادھوری ہی چھوڑ دینی پڑی۔ تو تاریخ کا گھنٹہ تھا۔ ٹیپو سلطان نے کس طرح اپنی آبرو بچائی اس پر لیکچر ہوتا رہا۔ مگر میں تو تاریخ کی دنیا سے دور نہ جانے کس دنیا میں بھٹک گئی تھی۔ مجھے معلوم ہونے لگا گویا کالج کی چھٹی ہو گئی ہے۔ اور وہ بھی ہمیشہ کے لئے۔ وہ نوجوان میری زندگی کا ساتھی بن گیا ہے۔ زندگی کا ساتھی بھی ایسا جس سے کبھی جدائی نہیں ہو سکتی۔ شادی شدہ زندگی بسر کرنے کا وہ خیال مجھے اتنا راحت پذیر معلوم پڑنے لگا۔ کہ میں بے سُدھ ہو گئی۔ کب کس کا گھنٹہ ہوا۔ میں ٹھیک ٹھیک سے سمجھ نہ سکی۔

کالج کا وقت ختم ہو گیا۔ میں نے اپنے گھر کا رُخ کیا۔ وہ نوجوان اُسی طرح میری انتظار میں کھڑا تھا۔ ایسا جان پڑتا تھا۔ جیسے میں اس کے دیکھنے کے لئے دنیا میں میرے سوا اور کچھ رہ ہی نہیں گیا ہے۔ مجھے دیکھتے ہی اس کے خوبصورت چہرے پر جو سُرخی دوڑ گئی۔ اسے دیکھ کر جو مجھے دلی مسرت حاصل ہوئی وہ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی شکل میں نمودار ہو گئی۔ میں اس کے پاس سے نکل گئی۔ میرے آگے بڑھتے ہی وہ نوجوان بھی میرے پیچھے پیچھے چل دیا۔ چند راستے اس روز جو باتیں کہی تھیں۔ ان کے باعث میرے دل میں یہ خوف پیدا ہو گیا۔ کہ یہ بھی میری کہیں بے عزتی نہ کر بیٹھے میں کچھ فاصلہ پر جا کر ٹھہر گئی۔ میں نے کچھ کڑی نظر سے اس کی جانب دیکھا۔ نوجوان سہم گیا میں نے دیکھا۔ اس کے قدموں کی رفتار مدھم ہو گئی تھی۔

میں پھر آگے بڑھ گئی۔ نوجوان پھر بھی میرے پیچھے تھا۔ میں پریشان تو ضرور تھی مگر دل ہی دل میں اس میں مجھے کچھ مسرت سی معلوم ہوتی تھی۔ میں چاہتی تو اس کو ڈانٹ سکتی تھی ذرا سا شور کر دیتی تو حضرت گھر کا راستہ بھول جاتے مگر مجھے تو ان باتوں سے لطف آ رہا تھا۔ نوجوان کا حوصلہ بڑھا۔ اس نے پاس آ کر کہا۔ "اگر آپ بُرا نہ مانیں۔ .....؟" بات کو ادھورا ہی چھوڑ کر اس نے سبز رنگ کا ایک چھوٹا سا لفافہ

میرے ہاتھ پر رکھ دیا۔ اسی دوران میں ایک زرد رنگ کی موٹر پاس آکر رُک گئی وہ بغیر کچھ کہے اس میں بیٹھ گیا۔ موٹر اس کو لے کر چلی گئی۔ میں نے بھی ادھر ادھر دیکھا کہ کہیں کوئی دیکھ تو نہیں رہا ہے۔ اور لمبے لمبے قدم بڑھا کر گھر کی طرف چل دی۔ لفافہ میں نے اپنی ایک کتاب میں دبا دیا۔

گھر پہنچ کر سب سے پہلے میں اس لفافہ کو خلوت میں پڑھنے کے لئے بیقرار ہو اٹھی والد صاحب دفتر سے لوٹ کر واپس آگئے تھے۔ اس لئے اس خیال سے کہ کہیں ان کی لفافہ پر نظر نہ پڑ جائے۔ میں سیدھی چھت پر چلی گئی اور ایک کاپی میں لفافہ رکھ کر میں نے اس کو آہستگی سے پھاڑ ڈالا۔ اس میں ایک پرزہ کاغذ پر لکھا ہوا تھا۔

"ایسا مزا کہاں تھا بھلا وصل یار میں"
"جو لطف آرہا ہے مجھے انتظار میں"

آزارِ محبت

میرے والد معمولی حیثیت کے آدمی تھے۔ ایک دفتر میں ۳۰ سال سے ملازمت کر رہے تھے۔ اور تب کہیں انہیں ایک سو روپیہ یا ہوا تنخواہ ملنے کی نوبت آئی تھی ایسے ایشور کی نظرِ عنایت سمجھئے یا خدائی قہر۔ ان کے یہاں چھ بچے تھے۔ ان میں پانچ تھیں لڑکیاں اور ایک لڑکا تھا۔ والد صاحب کے دل میں لڑکے اور لڑکیوں کے لئے کسی طرح کا امتیاز نہ تھا۔ وہ لڑکے کی نسبت لڑکیوں کو زیادہ پیار کرتے تھے دو ایک بار جب میری والدہ کبھی ان سے اس بات کی شکایت کرتیں تو والد صاحب کہتے کہ لڑکیاں تو پرایا مال ہیں۔ جس دن ہاتھ پیلے کر دیئے اسی دن دوسرے کی ہو گئیں پھر وہ تمہارے یہاں رہنے نہیں آئیں گی۔ لڑکے کا کیا ہے۔ وہ تو زندگی بھر تمہاری خدمت حاصل کر سکتا ہے

والد صاحب چاہتے تھے کہ ان کی سب لڑکیاں پڑھ لکھ کر عالم بنیں۔ اور ملک میں شہرت حاصل کریں۔ اس لئے وہ کوشش بھی کرتے تھے۔ اپنی معمولی حیثیت میں بھی انہوں نے میٹرک میں میرے پڑھنے کے لئے ایک اُستانی کا انتظام کیا۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد ہمسایوں نیز نزدیکی رشتہ داروں نے انہیں بہت سمجھایا کہ وہ مجھے اب زیادہ تعلیم نہ دلائیں۔ مگر والد صاحب نے ایک نہ سنی۔ انہوں نے سب کی مخالفت کی پرواہ نہ کر کے مجھے کالج میں داخل کرا دیا۔

والد صاحب کے بہت لاڈ پیار کے باعث میرا مزاج کرخت اور منہ پھٹ ہو گیا تھا کسی نے ذرا سی کوئی کڑوی بات کہی کہ ایسا سخت جواب دیا کہ سننے والا سن ہو کر رہ گیا۔ جب تک گھر میں تھی تب تک تو گھر میں ہی تکرار ہو کر رہ جاتی تھی مگر سکول میں پہنچنے پر

کئی بار ذرا ذرا سی بات پہ میری لڑکیوں سے تکرار ہو گئی۔ والد صاحب کے پاس اگر کوئی شکایت پہنچتی تو وہ اس پہ توجہ نہ دیتے تھے۔ اس باعث میرا حوصلہ بڑھتا جا رہا تھا کپڑوں کے معاملے میں میں اتنی فیشن پرست تھی کہ کبھی کبھی پاجامہ کے اوپر کوٹ قمیص پہن کر سکول پہنچ جاتی تھی۔ ہمسائیوں میں اس کی چرچا ہوتی تھی۔ والدہ منع کرتی تھی مگر والد صاحب کپڑے بنوا لاتے تھے۔ پھر بھلا میں کیوں نہ پہنتی۔

میٹرک کے بعد میرے والد صاحب نے میرا نام کالج میں درج کرا دیا۔ کالج کی زندگی کے آغاز میں ہی میں نے دیکھا کہ میرا دل کسی چیز کی غیر موجودگی کو محسوس کرتا ہے چند لڑکیاں ازدواجی زندگی کی باتیں سن سن کر میں سوچتی اگر میری بھی شادی ہو گئی ہوتی تو کیا اچھا ہوتا؟ ایک نوجوان ہر روز باقاعدہ میری انتظار میں کالج کے دروازے پہ کھڑا رہتا تھا۔ اسے دیکھنے کے لئے نہ جانے میرا دل کیوں پریشان رہتا۔ ظاہراً طور پر تو میں لاپرواہی کی نظر سے اس کو دیکھتی تھی مگر اسے دیکھ کر میرے دل میں ایک عجیب گدگدی سی پیدا ہو جاتی۔ اس دن اس نے جو شعر لکھ کر بھیجا تھا۔ اسے تو میں نے اتنی مرتبہ پڑھا کہ وہ مجھے زبانی یاد ہو گیا۔

میں سوچنے لگی کہ یہ نوجوان اگر دیگر نوجوانوں کی مانند کوئی لفنگا نکلا تو مجھے بدنام کر ڈالے گا۔ کیوں نہ اس کے متعلق سے پوچھوں، مگر دوسرے ہی لمحے سوچتی کہ بہت سیدھا سادہ ہے۔ دیکھو بیچارے نے کتنے دنوں بعد خط لکھنے کا حوصلہ کیا وہ بھی خط کہاں صرف ایک شعر جس میں نہ نام ہے اور نہ پتہ۔ اگر اس کا جواب بھی دینا چاہوں تو نہیں دے سکتی۔ نوجوان کی شکل صورت تو اچھی ہے کسی اچھے خاندان کا لڑکا لگتا ہے مگر ہے شرمیلا کھل کر بات نہیں کر سکتا۔

دوسرے دن جب میں کالج سے واپس آئی تو ان حضرت کو پھر میں اپنے پیچھے پیچھے چلتے پایا مگر بڑی شرافت کے ساتھ۔ وہ ایسے جا رہے تھے جیسے انہیں مجھ سے کوئی

کا وہ نہیں مجھ سے کچھ بھی کہنا سننا نہیں ہوا۔ راستے آہستہ چلتی ہوئی مکان کے سامنے آگئی مگر اس کی اتنی بھی جرأت نہ ہوئی کہ مجھ سے دو چار باتیں ہی کر سکے۔ میں خود اس سے کچھ باتیں کرنے کی خواہشمند تھی مگر اپنی طرف سے کیا پوچھتی۔ جب مکان آگیا اور میں اندر جانے کا ارادہ کرنے لگی تو میں اچانک نہ جانے کیسے میرے منہ سے نکل گیا "آپ کی گھڑی میں کیا بجا ہے؟"

میرے اچانک سوال سے وہ گھبرا گئے۔ اور گھبرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ میں جواب کی انتظار کئے بغیر ہی کھٹ کھٹ کرتی ہوئی زینے پر چڑھ گئی۔ گھر جا کر میں نے اپنے کمرے میں کتابیں رکھ دیں اور ناشتہ کرنے کے لئے باورچی خانہ میں چلی گئی۔ میرا بھائی سکول سے لوٹ آیا تھا اور سینما جانے کے لئے والد سے اصرار کر رہا تھا۔ والدہ اُسے سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی کہ اتنے میں میں بھی پہنچ گئی۔ میرا گھر کے تمام بچوں پر رعب تھا۔ مجھے دیکھ کر پھر لڑکے کا یہ حوصلہ نہ ہوا کہ وہ سینما کے متعلق کچھ کہے کیونکہ اسے معلوم تھا کہ والدہ جلدی سے [illegible] کا کام کرتی ہیں۔ [illegible] میرے دونوں [illegible] تھے اس کی ہر بات میں تک [illegible] میں ناشتہ کر کے جب [illegible] پر گئی تو دیکھا کہ وہ [illegible] اس کو [illegible] کا [illegible] ہے میں میں نے سوچا کہ کہیں کوئی دیکھ لیگا۔ [illegible] اندازہ لگا سکے کہ [illegible] تلاش میں گلی کی خاک چھان رہا ہے۔ اس لئے میں [illegible] سے نیچے اتر آئی۔ اور لیٹنے کمرے میں جا کر لیٹ گئی طبیعت نہ جانے کیوں بے چین ہو گئی۔ میں طرح طرح کے خیالات میں غلطاں رہ کر آخر کار سو گئی۔

تھوڑی دیر کے بعد جب میری آنکھ کھلی تو میرے کانوں میں والد صاحب کا کمرہ تھا آ میں کسی کے ہنس ہنس باتیں کرنے کی آواز مجھے سنائی دی۔ میں نے کان لگا کر سننا شروع کیا معلوم ہوا والدہ اور والد صاحب باتیں کر رہے ہیں۔ میں دروازے کے پاس جا کر سننے لگی۔ والد صاحب کہہ رہے تھے "لڑکا کیا ہے ہیرا ہے ہیرا" اگر تم اسے ایک بار دیکھو گی تو کھانا پینا بھول جاؤ گی اپنی محنت سے پڑھ کر ایم ایس سی پاس کیا ہے۔ اب [illegible] روپیہ ماہوار تنخواہ پر کالج میں پروفیسر ہے۔ ایسا [illegible] کیا کہوں میں جب اس سے ملا اور [illegible] کی شادی کا ذکر کیا تو شرم کے مارے پانی پانی ہو گیا۔ اگر کسی لڑکی کے سامنے شادی کی بات کیجئے تو شاید وہ بھی اتنی نہ

شرما گئی جتنا وہ شرما گیا میں تو کہتا ہوں لڑکا ہزاروں میں ایک ہے۔"

"تو پھر دیر کس بات کی ہے؟ شادی جھٹ پٹ کیوں نہیں کر دیتے گھر میں اور کون ہے" والدہ نے پوچھا

والد صاحب بولے "بس ایک ہی کسر ہے۔ گھر میں اور کوئی نہیں ہے لڑکے کی صرف بوڑھی ماں ہے۔ پوری دیوی ہے۔ بیچاری نے بڑی محنت سے بڑی بڑی امیدیں باندھ کر لڑکے کو تعلیم دلائی ہے"

والدہ کچھ دیر تک خاموش رہی بعد ازاں کہنے لگی۔ "لڑکا کماتا کھاتا ہے یہ کیا کم ہے؟۔ اب وہ زمانہ نہیں رہا جب چار آدمیوں کا گھر دیکھا جاتا تھا۔ اب وہ آدمی کہاں رہے ہیں جو آفت مصیبت میں دکھ درد کے ساتھی بنیں۔ اب تو روپیہ تقسیم کرنیوالے رہ گئے ہیں۔ اگر دولت ہے تو اسکے لئے بیسیوں وارث بن جائیں گے مگر مصیبت میں ساتھ دینے والا کوئی نہ ملیگا۔ میں تو کہتی ہوں لڑکے کے عزیز و اقارب نہیں ہیں تو اچھا ہے جو کمائیگا اپنے ہی پاس رکھیگا۔ اور پرمیا تو ایسی معمولی بھی نہیں ہے کہ اپنے گھر کی دیکھ بھال نہ کر سکے۔

اگر تمہاری رائے ہو تو پرمیا سے بھی ذرا پوچھ لینا۔ میں اس کا فوٹو لے آیا ہوں۔ اسے دکھلا دینا۔ اگر اس کی رائے ہو تو پھر شادی ہونے میں کیا دیر لگتی ہے تم چاہو گی تو اس ماہ میں ہی ہو جائیگی۔ دیکھو یہ ہے اس کا فوٹو۔

اس کے بعد سناٹا چھا گیا۔ شاید والد صاحب تصویر دے کر اوپر سونے کے لئے چلے گئے۔ اور والدہ ہرلیش کو دودھ دینے چلی گئی میری خوشی کا ٹھکانا نہ رہا۔ میں بیتاب تھی کہ والد صاحب نے جس پروفیسر کے ساتھ شادی کرنے کا ارادہ کیا ہے اس کی تصویر جلدی سے جلدی دیکھوں میں جانتی تھی کہ والدہ دوسرے دن ضرور ہی مجھے وہ فوٹو دکھائے گی۔ مگر میں اپنی بیتابی کو دبا نہ سکی۔ اپنی ایک کتاب ڈھونڈنے کے بہانے میں اس کمرے میں گئی۔ جہاں والد صاحب اور والدہ میں باہم گفتگو ہو رہی تھی۔ میں نے ڈھونڈھ کر اس فوٹو کو نکال لیا۔ اور اپنے کمرے میں چلی آئی۔ میں نے فوٹو میں دیکھا کہ سوٹ بوٹ زیب تن کئے ایک ادھیڑ عمر مسکرا رہا ہے۔

پہلی ملاقات

میری شادی ہوگئی۔ میں سسرال کے لئے چلی۔ وہ مجھے جی بھر کر دیکھنے کے لئے کتنے بیتاب تھے اس کا پتہ مجھے تب چلا جب ایک میل کا راستہ موٹر سے طے کرنا ان کے لئے مشکل ہوگیا وہ میرے ہی پہلو میں موٹر میں بیٹھے تھے۔ انہوں نے آہستگی سے کہا۔ دیکھو میری ماں کا مزاج کچھ کرخت ہے تم ذرا نرمی سے کام لینا۔" میں بھلا ان کی اس نیک صلاح کا کیا جواب دیتی۔ میں کچھ کہتی مگر رخصت ہوتے وقت والدہ نے کہدیا تھا۔ کہ کسی بھی بات کا بغیر سوچے سمجھے جواب دینا سسرال میں ٹھیک نہ ہوگا میں بولنا بھی چاہتی تھی۔ مگر ایک مرتبہ گھونگٹ کے اندر سے ذرا سا منہ نکال کر میں نے مسکرا کر صرف اتنا ہی کہا "اچھا۔"

میں جب سسرال پہنچی تو دروازے پر مستورات کا ایک خاصہ مجمع سا لگا ہوا تھا۔ ایک ہم عمر لڑکی نے ہم لوگوں کو موٹر سے اُتارا۔ میں سلیپر پہنے ہوئے کھٹ کھٹ کرتی ہوئی آگے چلی میں نے دیکھا سامنے ایک چھوٹا سا کچی مٹی کا مکان ہے۔ دروازے پر کلس وغیرہ رکھے ہوئے تھے معمولی پوجا کے جلنے کے بعد میں مکان کے اندر لے جائی گئی۔ اندر پہنچکر ایک عجب تماشہ سا شروع ہوگیا۔ جو عورت آتی وہ میرے منہ کو نہار نہار کر دیکھتی۔ دیکھنے کے بعد کسی نے کہا۔ بہو تو بھائی بہت حسین ہے" کسی نے کہا۔ ہاں آنکھیں تو بیلے جیسی خوب بڑی بڑی ہیں میرا مسکرانا کچھ بوڑھی عورتوں کو پسند نہ تھا۔ ایک نے تو کہہ بھی دیا۔ یہ سسرال ہے۔ کالج نہیں۔ ساس سسر کے گھر میں اس طرح سے دانت نکالنا اچھا نہیں۔ پہلا ہی دن تھا۔ ورنہ میں اس بڑھیا کو ایسا جواب دیتی۔ جو پھر کبھی آنے کا نام نہ لیتی۔ مگر اس وقت میں دل مسوس کر اپنا غصہ پی کر رہ گئی۔

مجھے والد صاحب نے گانے بجانے کی خاص تعلیم تو نہیں دلوائی تھی۔ مگر تقریباً دو سال تک ایک ماہر راگ مجھے گانے کی تعلیم دیتا رہا تھا۔ اس وقت میں راگ کا خاص مزا تو نہیں لے سکی۔ مگر میرا رجحان راگ کی طرف تھا۔ جب بڑی بوڑھی چلی گئیں تو میری ہم عمر دو تین لڑکیاں رہ

گئیں۔ وہاں لڑکیوں نے مجھ سے گانے کے لئے اصرار کیا۔ میں ان کا اصرار ٹال نہ سکی۔ [illegible]
ایک گانا سنایا جو کالج میں سیکھا تھا۔ ایک دو اور گانے گائے۔ لڑکیوں نے انھیں بہت پسند کیا

کچھ دیر بعد سب لڑکیاں چلی گئیں۔ اور گھر میں میں اور میری ساس رہ گئیں۔ جب تک سب
لڑکیاں رہیں تماشہ تو رہا لیکن ان کے جانے کے بعد مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے بہشت
سے نکل کر [illegible] میں آ گئی ہوں۔ وہ ایک چھوٹا سا گھر تھا جس میں باہر ایک برآمدہ تھا۔
چھوٹا سا ایک صحن تھا جس کے آس پاس تین چھوٹی چھوٹی کوٹھڑیاں تھیں۔ ان میں ایک کوٹھری کا
باورچی خانہ تھا اور دوسری دونوں کوٹھڑیوں میں سامان رکھا ہوا تھا۔ میں سوچ رہی تھی کہ
پروفیسر صاحب کے سونے کا کمرہ کونسا ہے کیونکہ گھر میں ان کوٹھڑیوں کے سوا اور کوئی جگہ
نہ تھی۔ میں نے انہیں کئی بار دروازہ کے سامنے کھڑے ہوئے دیکھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ مجھ سے
کچھ بات کرنا چاہتے ہیں۔

رفتہ رفتہ رات ہو گئی۔ میری ساس نے کھانا تیار کیا۔ میں ان کی مدد کرنا چاہتی تھی۔ مگر
انھوں نے منع کر دیا۔ میں دلہنوں کی مانند سمٹ کر بیٹھ گئی۔ وہ پانی پینے کے بہانے آئے تو مجھے
گھونگھٹ کی ایک طرف سے دیکھ کر مسکراتے ہوئے چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد پان کھانے کے بہانے
پھر آئے۔ ساس جی کھانا بنا رہی تھیں۔ اس لئے انھوں نے مجھے پان لگا دینے کو کہہ دیا۔ میں
پان لگانے لگی اور جانے کیوں اتنا چونا لگا دیا کہ [illegible] وہ پان کھا کر چلے گئے۔ [illegible]
کر کے [illegible] فارغ ہوئے سونے کا وقت ہو گیا۔ میں کھانا کھا چکی تھی۔ ساس کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی
انھوں نے کہا۔ بیٹا اب سب کھانا کھا چکے جاؤ برآمدے میں جا کر سو رہو۔ میں اپنی گٹھری اٹھا کر اوپر
چلی گئی۔ کمرہ چھوٹا سا تھا۔ مگر قرینے سے سب چیزیں سجی ہوئی تھیں۔ میز پر انگریزی کی پانچ سات
کتابیں پڑی ہوئی تھیں۔ جن کے رکھنے کا ڈھنگ بتلا رہا تھا کہ ہر وقت ان کا مطالعہ کیا
جاتا ہے۔ کمرے میں صرف دو تصویریں تھیں۔ ایک تصویر مہاتما گاندھی کی تھی۔ اور دوسری تصویر
عمر خیام کی رباعیوں کی بنا پر کسی مصور نے بنائی تھی۔ کمرے کے بیچوں بیچ کونے میں ایک پلنگ بچھا

تھا اور اسکے سرہانے تپائی پر ایک لیمپ جل رہا تھا۔ میں ہمارے پلنگ پر جا کر لیٹ گئی۔ مگر کافی دیر تک پڑے رہنے کے بعد بھی مجھے نیند نہ آئی۔ وہ وقت گزارنے کے لئے میں میز پر سے اخبار اٹھا کر پڑھنے لگی۔

مجھے زیادہ دیر تک انتظار نہیں کرنی پڑی تھی۔ وہ طلوع الصبح نمودار ہوتے ہوئے آفتاب کی سنہری شعاعوں کی طرح مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے آئے۔ میں سہم کر اٹھ بیٹھی۔ وہ بیٹھی رہ کر دیکھتے ہی رہے مگر میں ایک لمحہ میں ہی پلنگ سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ بیٹھ گئے۔ جسکے باعث میں پانی پانی ہوئی جا رہی تھی۔ ان سے ملنے کے لئے میں جتنی بے تاب تھی اتنی آمد پر وہ بیتابی دور ہو گئی۔ میں شرم کے مارے زمین میں گڑنے لگی۔ انہوں نے ہاتھ پکڑ کر مجھے پلنگ پر بٹھاتے ہوئے کہا۔ میں کیا کوئی غیر آدمی ہوں جو اتنا شرما رہی ہو۔ ان کا ہاتھ چھو جانے سے میرے جسم میں برقی سی دوڑ گئی۔ میں سہم کر سکڑ کر ان کے پاس جا کر بیٹھ گئی

کافی عرصہ تک ہم دونوں خاموش رہے۔ انہیں بات کرنے کے لئے شاید کوئی عنوان ہی نہ ملتا تھا۔ اور میں حیا کے باعث کچھ بول ہی نہ سکتی تھی۔ کبھی وہ میری طرف دیکھتے اور کبھی ذرا سا سر اوپر اٹھا کر میں ان کے چہرے کی طرف دیکھنے لگتی کافی عرصہ تک ہم دونوں یوں ہی اسی طرح گونگے بنے رہے۔

عورت کی زندگی میں سہاگ کی پہلی رات کتنی راحت پذیر کتنی دلکش اور کتنی مخمور ہوتی ہے خواہش ہوتی تھی رات اتنی طویل ہو جائے کہ اس کا کبھی انجام ہی نہ ہو پاتی کی معشوق کے دل نے یہ رونا رویا تھا کہ طلوع الصبح نمودار ہوتے ہوئے آفتاب کی سنہری شعلعیں جب پھوٹتی ہیں میرا دل ٹوٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے مگر میرا دل کہتا تھا کہ ہماری اس رات کا انجام نہ ہو۔ دنیا میں کہاں کیا ہو رہا ہے۔ یہ جاننے کے لئے ہم دونوں میں کسی کی خواہش نہ تھی۔ وہ چھوٹا سا مکان ہی ہم لوگوں کے لئے ایک وسیع دنیا بنی ہوئی تھی۔

وہ بہت سیدھے سادھے تھے۔ عورتیں قدرتاً ہی شکی مزاج کی ہوتی ہیں وہ یہ برداشت نہیں کر سکتیں کہ ان کا شوہر کسی دوسری عورت سے پیار کرے محبت کرنا تو خیر دور کی بات ہے۔

کوئی نازنین یہ بھی برداشت نہیں کریگی کہ اس کا شوہر کسی دوسری عورت سے ہنس کر بات بھی کرے جس طرح کسی دوسرے نوجوان سے اپنی بیوی کو بات کرتے ہوئے دیکھ کر شوہر کا پارہ ساتویں آسمان پر پہنچ جاتا ہے۔ بعینہ اسی طرح بیوی بھی اپنے شوہر کے منہ سے کسی لڑکی کی شکل و صورت، خوبصورتی اور اوصاف کی تعریف سنکر جل بھن کر خاک ہو جاتی ہے۔ لوگوں میں کافی دیر تک بات چیت ہوتی رہی میرے شوہر نے گانا سنانے کے لئے اصرار کیا دن میں میں نے لڑکیوں کیساتھ بیٹھ کر ڈھولک پر دو تین گیت سنائے تھے وہ انہیں پسند آئے تھے انکے بار بار اصرار کرنے پر میں نے آہستہ آہستہ انہیں دوبارہ گایا۔ میرا گانا سن کر انکی حالت ایسی ہو گئی جیسے کسی نے ان پر جادو کر دیا ہو۔ وہ میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں رکھ کر بولے "پرمیا! میری بارہ سال کی ریاضت آج کامیاب ہوئی ہے"

"وہ کیسے؟" میں نے ہچکچاتے ہوئے سوال کیا۔ وہ تھوڑی دیر تک خاموش رہے اور پھر ایک لمبا سانس کھینچتے ہوئے بولے "آج اگر: الدصاحب زندہ ہوتے تو تمہارے باعث وہ راحت اور تسکین محسوس کرتے۔ آج انہیں معلوم ہوتا کہ ان کا دلویندر جس قسم کی لڑکی سے شادی کرنے کا عہد کئے ہوئے تھا جس کے لئے اس نے اپنے قابل تعظیم باپ کے حکم کی نافرمانی کی وہ لڑکی آخرکار دیویندر کو پرمیا کی صورت میں حاصل ہوئی" یہ کہتے کہتے ان کی آنکھیں آنسوؤں سے تر ہو گئیں۔ میں نے حیرت سے دیکھا ان کی آنکھوں سے موتیوں کے دانے گر رہے تھے۔

میں نے ان کو دلاسہ دیتے ہوئے کہا، رنجیدہ ہونے سے کیا فائدہ؟ میری قسمت میں اُن کا دیدار کرنا نہیں لکھا تھا۔ آپ کو اب اس واقعہ کی یاد کر کے رنجیدہ نہ ہونا چاہیئے۔ میں نے اپنے سُرخ ساڑھی کے کونے سے انکی آنکھیں پونچھ ڈالیں۔ ان کی توجہ دوسری جانب رجوع کرنے کے لئے میں نے کہا "آپ کچھ دنوں تک کانپور میں بھی رہے ہیں"

"ہاں" ان کا جواب تھا۔

"وہاں آپ کی کافی جان پہچان بھی ہو گی۔" کیوں نہیں۔ بہت جان پہچان تھی۔ اگر لوگوں سے واقفیت نہ بڑھاتا تو بھلا میری گذر کیسے ہوتی۔ میرے پاس اتنا پیسہ تو تھا نہیں کہ جس سے تعلیم کا خرچ

آرام کے ساتھ چلتا۔ مجھے تو اپنی خوراک اور تعلیم دونوں کا خود ہی انتظام کرنا پڑتا تھا۔ اس لئے میں زیادہ سے زیادہ لوگوں سے میل ملاقات کرتا تھا۔ ان لوگوں کی واقفیت سے مجھے کہیں نہ کہیں ٹیوشن مل جاتی تھی جس سے اپنی گذر کرتا تھا۔ جان پہچان نہ ہونے سے میں اتنی تعلیم کبھی بھی نہ حاصل کرسکتا۔ تم نے یہ کیوں دریافت کیا؟

کچھ نہیں یونہی پوچھ لیا۔ اچھا تمہیں میری قسم ہے سچ سچ بتلانا؟ یہ کہہ کر میں خاموش ہوگئی وہ بیتابی کے ساتھ میرے چہرے کی طرف دیکھنے لگے میں خاموش تھی۔ جب کافی دیر تک خاموش رہی۔ تو انہوں نے کہا۔ کیوں خاموش کیوں ہوگئی۔ کیا پوچھنا چاہتی ہو پوچھو۔ میں تمہاری قسم کھاکر کہتا ہوں جو کچھ پوچھو گی اسکا درست جواب دونگا۔ تم میری زندگی کی رفیقہ بن چکی ہو بھلا تم سے کچھ چھپاؤنگا نہیں میں پھر بھی خاموش رہی۔ میری ٹھوڑی پر ہلکی سے چپت لگاتے ہوئے انہوں نے کہا۔ تمہیں میری قسم ہے۔ جو پوچھنا چاہو بغیر کسی ہچکچاہٹ کے پوچھ لو۔ میں ٹھیک ٹھیک اور صحیح جواب دونگا!

"اچھا ناراض تو نہیں ہو گے! نہیں قطعی نہیں۔"

"اچھا تو ایک بات بتلائیے۔ آپ نے ابھی تک کسی لڑکی سے پیار کیا ہے؟

میرا سوال سنکر وہ چونک پڑے۔ تھوڑی دیر تک سوچتے رہے۔ بعد ازاں بولے۔

"ہاں کیا ہے؟" "کب؟" میرا سوال تھا۔ "جب میں الہ آباد میں پڑھتا تھا۔"

اس جواب سے میرا جسم جل اٹھا میرا جسم غصہ سے کانپ اٹھا۔ اگر اس وقت کوئی میرے چہرے پر نظر ڈالتا تو صاف طور سے بھانپ جاتا کہ ان کے اس جواب سے میری رگ رگ میں آگ لگ گئی ہے اپنے غصہ کو ضبط کرتے ہوئے میں نے دوبارہ دریافت کیا وہ کون خوش قسمت لڑکی تھی۔ کیا میں اس کا نام جان سکتی ہوں۔

تم میری زندگی کی ساتھی ہو۔ میں تم سے کچھ نہیں چھپاؤنگا۔ تم خواہ مجھ سے نفرت ہی کیوں نہ کرنے لگو۔ گو میں تم سے کوئی بات چھپا کر نہیں رکھونگا میری زندگی کا ہر ایک واقعہ تمہیں معلوم ہی ہو جائیگا میں کچھ بھی پوشیدہ نہیں رکھونگا وہ کچھ کہنا ہی چاہتے تھے۔ کہ آفتاب کی شعاعوں نے آکر ہمیں خبردار کر دیا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے اور بولے اچھا تو پھر آج رات کو میں تمہیں اپنی داستان محبت سناؤنگا۔

میں نے ذرا مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "اچھا" وہ جلدی سے دھم دھم کرتے ہوئے نیچے اتر گئے۔

اُن کی پہلی معشوقہ

وہ دن تفکرات میں کٹ دیا۔ دن بھر کمرے میں پڑی سوتی رہی۔ اور وہ اپنے کسی دوست کے یہاں چلے گئے۔ شام کو پاس پڑوس کی مستورات مجھے دیکھنے کے لئے آگئیں اس لئے خواہش نہ رہنے پر بھی مجھے دیکھنے کے لئے آگئیں اسلئے خواہش نہ رہنے پر بھی مجھے ان سے ملنے کے لئے صحن میں بیٹھنا پڑا کسی نے میری صورت کی تعریف کی۔ تو کوئی خفا ہو کر یہ بھی کہہ بیٹھی بہن اصورت لیکر کوئی وکان کھول کر تو بیٹھنا نہیں ہے۔ پرماتما جیسا بناتا ہے۔ ویسا ہی آدمی بن جاتا ہے۔ یہ تو ایشور کی بخشش ہے کسی کو ملتی ہے کسی کو نہیں ملتی۔ ایک دوسری عورت جو مزاج کی ذرا تیز تھی کہنے لگی میری بہو تھا ایسی حسین نہیں ہے۔۔۔۔۔ مگر کام کاج میں ایسی ہے کہ کیا کہوں؟ خوبصورتی کو لیکر بہن کیا کرنا ہے!

ان کی باتیں ایسی بیہودہ بیجا اور بے سر پیر کے تھیں کہ خواہش ہوتی تھی کہ اٹھ کر چلی جاؤں مگر بد تہذیبی کے خوف سے نہ اٹھ سکی۔ یہ مستورات رات کے آٹھ بجے تک مجھے گھیرے رہیں ان کے جانے کے بعد دو گھنٹہ کے اندر وہ تقریباً دس بارہ مرتبہ گھر میں آئے۔ ایک مرتبہ میرے پاؤں پر اپنے پاؤں کی انگلیاں ایسے ڈھنگ سے دبا کر چلے گئے کہ میں تلملا گئی: دوسری بار آئے تو میں نے دیکھا انکے ہاتھ میں کسی سینما کا اشتہار تھا۔ میں نے ان کی جانب دیکھا اور مسکرادی انہوں نے اس اشتہار کی پڑیا بنائی۔ اور زور سے میرے منہ پر دے ماری۔

اسطرح انتظار میں رات کے ساڑھے نو بج گئے۔ کھانا کھا کر میں کمرے میں لیٹنے کے لئے چلی گئی۔ وہ میرے پہنچنے کے پندرہ منٹ بعد ہی پہنچ گئے۔ میں انکی داستان محبت سننے کے لئے بے تاب تھی۔ ان کے پہنچتے ہی میں نے کہا " ہاں آپ کی معشوقہ کون تھی ؟

" ذرا بیٹھو اور کوئی بات کرو جب کہدیا کہ بتلاؤں گا تو اطمینان رکھو کر بتلاؤں گا۔ تم اتنی بیتاب کیوں ہو۔ کیا تم نے اپنی زندگی میں کسی کو کبھی محبت کی نگاہ سے نہیں دیکھا۔

میرے پاؤں کے نیچے زمین کھسک سی گئی۔ مجھے معلوم ہوا جیسے میرے کالج کی زندگی کی وہ ادھوری

داستان محبت انہیں سب معلوم ہے۔ میرے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔ کسی نامعلوم شک سے میں کانپ اٹھی۔ مجھے یاد آ گیا ذرا سے شک کے باعث دھوبی نے اپنی بیوی کو گھر سے نکال دیا تھا۔ اس کا قصور یہی تھا۔ کہ وہ اپنے شوہر کی اجازت لئے بغیر ہی اپنے بیمار باپ کی خبر لینے چلی گئی۔ وہ صرف دو تین دن اپنے شوہر کی اجازت لئے بغیر اس کی ناراضگی کی پرواہ نہ کر کے اپنے باپ کے گھر رہی۔ دھوبی نے اس پر راجندر کو طعنہ دیا اسکے باعث عصمت مآب سیتا کو بن باس (جلاوطنی) کا دُکھ برداشت کرنا پڑا۔ میں نے اس نوجوان کو پیار کیا یا نہیں یہ تو میں خود نہیں جانتی تھی مگر مجھے خوف ہو رہا تھا۔ کہ کس طرح میرے شوہر کو یہ راز معلوم ہو گیا۔ ایک لمحہ میں ہی نہ جانے کتنی باتیں میرے دماغ میں آئیں اور گئیں۔

مجھے خاموش دیکھ کر وہ بولے۔ اچھا پہلے میں تمہیں اپنی داستان محبت سناتا ہوں۔ مگر بعد میں تمہیں بھی اپنی داستان محبت میرے گوش گزار کرنی پڑے گی۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تم جو کچھ مجھے بھی کہو گی۔ اس سے میں ناراض نہیں ہوں گا۔ کیونکہ ہم لوگوں نے ابھی تک جو کچھ کیا ہے۔ اس کے لئے ہم ایک دوسرے کے سامنے جواب دہ نہیں تھے۔

میں کیا جواب دیتی۔ وہ کہنے لگے۔ دیکھو میں ہمیشہ بدحالتوں سے جنگ کرتا آیا ہوں غریبی نے میرے راستہ میں جو روکاوٹیں حائل کی تھیں۔ میں نے مستقل ارادہ کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا۔ میں لڑکپن سے ہی مصیبتوں کا مقابلہ کرنے کا عادی ہو گیا ہوں۔ اندنوں میں الٰہ آباد میں رہتا تھا۔ شہر سے بہت دُور ایک رئیس کی کوٹھی تھی۔ وہ رئیس کافی تعلیم یافتہ اور طلبا کا مددگار تھا۔ مجھ پر رحم کر کے اس نے اپنے بنگلے کے نزدیک ایک مکان مجھے مفت رہنے کے لئے دے دیا۔ میں اس مکان میں رہتا اور ہاتھ سے کھانا بناتا۔ اب جب چار پیسے پیدا کرنے لگا ہوں۔ تو بھوک نہیں لگتی۔ مگر اس وقت ہاضمہ کافی تیز تھا۔ کالج سے لوٹ کر چولہے سے سر مارتا۔ تین پاؤ آٹا گوندھتا۔ مگر شام کے لئے مشکل سے دو تین روٹیاں بچتیں۔ ایسی بھوک بڑھ گئی تھی۔ کبھی کبھی روٹیاں بنانے کی خواہش نہ ہوتی تو چنے چبا کر

ہی رہ جاتا۔ پیسے کی اتنی کمی تھی۔ کہ ایک پیسے کی شکر کا جس دن شربت پی لیتا تھا۔ اس دن سمجھتا تھا۔ کہ آج بہت فضول خرچی کی ہے۔

غریبی کا اس طرح سامنا کر رہا تھا مگر دل گھبراتا نہیں تھا۔ امید کے سہارے جی رہا تھا۔ سوچتا تھا کہ کسی نہ کسی دن تو ہمارے دن بھی پھریں گے ہی میں جس مکان میں رہتا تھا۔ اسکے پہلو میں ایک تین منزلہ مکان تھا۔ میں جس کمرے میں بیٹھ کر پڑھتا لکھتا تھا۔ عین اسکے سامنے ایک کمرہ تھا۔ جسمیں دو لڑکیاں اچھلتی کودتی دکھلائی دیتی تھیں۔ کچھ ہی دنوں میں مجھے معلوم ہو گیا۔ کہ یہ دونو بہنیں ہیں۔ ان میں ایک کی عمر ۲۰-۲۱ برس کی تھی اور دوسری کی ۱۷-۱۸ برس دونوں بہت ہی حسین۔ مگر تھیں دونو ہی کنواری وہ دونوں ہی مجھے دیکھتیں اور کافی دیر تک اپنے برآمدے کے سامنے کھڑی رہتیں۔ میں بھی کبھی انہیں دیکھتا۔ تو کتاب بند کر کمرے کے سامنے کھلی چھت پر آ کر کھڑا ہو جاتا اور غور سے ان کی طرف دیکھتا رہتا۔

جوانی کے دن درحقیقت وہ دن ہیں۔ جب انسان کو اپنے آپکی بھی خبر نہیں رہتی۔ میں پڑھنا لکھنا بھولکر ان لڑکیوں کو دیکھنے میں محو رہنے لگا۔ انکے فراق میں شعر لکھنا شروع ہو گیا کبھی کبھی محبت آمیز عشقیہ اشعار بلند آواز سے گانے لگتا۔ وہ دونوں ہنستیں اور کھل کھلا کر ہنس دیتیں ان کی اس ہنسی سے میرا حوصلہ بڑھتا۔ میں سمجھتا کہ وہ بھی میری محبت کا جواب دے رہی ہیں۔ اور درحقیقت بات تھی بھی ایسی ہی۔ ان میں جو عمر میں چھوٹی تھی۔ اس کی چلبلاہٹ غضب کی تھی۔ اس کی مسکراہٹ میں غضب کا جادو تھا۔ دیکھو تم نے بُرا نہ ماننا تم بھی کبھی کبھی جب ہاتھ کا ہلکا جھٹکا دیکر ذرا تن کر مسکراتی ہوئی چائے پائی پر سے اٹھ جاتی ہو تو مجھے اسوقت یامنی کی یاد آجاتی ہے۔

میری رگ رگ غصہ سے کانپ رہی تھی۔ جس یامنی کی صورت اور حسن کی وہ تعریف کر رہے تھے اس وقت وہ اگر میرے سامنے آجاتی تو چڑیل کا منہ چھلس دیتی۔ مگر اس وقت مجھے تو انکی داستان محبت سننی تھی۔ میں نے اپنا غصہ چھپاتے ہوئے کہا: "چلو رہنے بھی دو۔"

کہاں وہ اور کہاں میں۔ اچھا تو پھر یامنی کی بہن کی طرف آپکا رجحان کم تھا؟

ہاں وہ عمر میں بڑی تھی۔ مگر شکل میں وہ یامنی جیسی نہ تھی۔ میں دن بھر یا تو یونیورسٹی میں رہتا تھا یا ٹیوشن پر۔ گھر پر لوٹتا تو بس یامنی کے ذکر کے سوائے اور کوئی تذکرہ میرے لئے نہ تھا۔ ابھی تک ہم لوگوں خط و کتابت شروع نہ ہوئی تھی۔ میں نے پتہ لگایا۔ تو معلوم ہوا۔ کہ یامنی کے بھائی کسی دفتر میں کلرک ہیں۔ چالیس روپیہ ماہوار تنخواہ پاتے ہیں۔ گھر میں ہیں۔ ان کی بیوی۔ تین چار بچے اور کنواری دو بہنیں۔ اعلےٰ ذات کے برہمن ہونے کے باعث بہنوں کی شادی کرنا ان کے لئے مشکل ہو رہا ہے جہیز کے بغیر کوئی شادی کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا اور بیچارے دینا ناتھ پنڈت تنخواہ میں سے کچھ بچا بھی نہیں سکتے۔ بہنوں کی شادی کے لئے وہ فکرمند تھے دو ایک بار راستہ میں میری ان کی ملاقات ہو گئی۔ میں نے ان کے ساتھ ہمدردی ظاہر کرنے کے لئے رسم جہیز کی جو بدگوئی کی تو وہ مجھ سے بہت بھگت ہو گئے۔

میری محبت کا بیج بڑھتا ہی گیا۔ کچھ دنوں کے بعد تو میری یہ حالت ہو گئی۔ کہ لالٹین روشن کر چھت پر آکر بیٹھ جاتا اور اس بات کی کوشش کرتا کہ کب یامنی سامنے کے برآمدے میں آئے اور آکر جلوہ دکھا جائے۔ اس کی بہن سبھاشنی میری اس حالت کا احساس کرتی۔ اور یامنی کو کسی نہ کسی بہانے سے برآمدے میں کھینچ لاتی۔ کئی بار تو میں نے دیکھا کہ وہ زبردستی گھسیٹ کر اُسے لے آئی ہے۔ انکا برآمدہ اتنا قریب تھا۔ کہ ان کی باتیں تک مجھے اپنی چھت پر سنائی دیتی تھیں۔ محبت کا مرض بڑھتا ہی گیا۔

ایک دن میں شام کو آٹھ بجے میں گھر واپس آیا۔ دل میں نئی امنگ لیکر۔ سوچ رہا تھا آج دیوالی کا دن ہے۔ اگر جیب میں پیسے ہوتے تو یامنی کو کوئی خوبصورت تحفہ نذر کرتا۔ مگر غریبی کی بے شمار ٹھوکروں سے شکستہ دل اس بات کو سوچنے کا بھی زیادہ عرصہ تک حوصلہ نہ کر سکا۔ اس وقت مہینے میں ۱۴ دن باقی تھے۔ اور جیب میں صرف چار روپیہ

اور کچھ آنے تھے۔ میں نے اپنے پڑھنے کا کمرہ کھول کر اپنے ہاتھ کی کتاب اس ٹوٹی میز پر پٹک دی۔ جو اپنی حالت دکھلا کر میری غریبی کا ڈھنڈورہ پیٹ رہی تھی۔ میں کوٹ اتار ہی رہا تھا۔ کہ میرے کندھے سے کوئی چیز ٹکرا کر زمین پر گری۔ کمرے میں تاریکی تھی۔ میری نگاہ یامنی کے برآمدے کی طرف گئی۔ دیکھا سامنے کھڑی وہ مسکرا رہی تھی۔ میں نے دیا سلائی ڈھونڈھ کر لالٹین روشن کی۔ اور کندھے سے ٹکرانے والی چیز کی تلاش کرنے لگا میں نے دیکھا کاغذ کی پڑیا پلنگ کے نیچے پڑی ہے۔ میں نے اسے کھولا۔ اس میں دو پان تھے۔ ایک چھوٹے سے ٹکڑے پر لکھا تھا "دیوالی کی نذر" میں نے بڑی محبت سے ان دونوں پانوں کو پیشانی سے لگایا۔ ان پانوں سے خوشبو کی لپٹیں اُٹھ رہی تھیں۔ میں نے وہ دونوں پان کھالئے۔ ان پانوں میں پریما تم سے سچ کہتا ہوں اتنا سرور محسوس ہوا۔ شاید آب حیات نوش کرنے میں دیوتاؤں کو بھی وہ سرور نصیب نہ ہوا ہوگا۔

پان میرے منہ میں تھے اور میں اس ٹوٹی پھوٹی چارپائی پر پڑا ہوا سوچ رہا تھا۔ کہ یامنی کو کیا تحفہ نذر کروں۔ اس کے پرزہ کاغذ پر صرف "دیا" لکھا ہوا تھا۔ اس سے میں نے یہ نتیجہ نکالا۔ کہ جسے میں پیار کرتا ہوں وہ بھی میرے لئے پریشان ہے آدمی جب کسی معشوقہ کو کچھ دینا چاہتا ہے اور اسوقت اس کے پاس پیسہ نہیں ہوتا۔ تو اُسے اپنی غریبی پر غصہ آتا ہے۔ اس وقت میرے پاس چار روپے اور کچھ آنے بچے تھے۔ میں گھر جانے کا ارادہ کر رہا تھا۔ مگر یامنی کو دیوالی کی خوشی میں کچھ نذر ضرور کرنی چاہیئے۔ یہ بات لاکھ کوشش کرنے پر بھی میرے دماغ سے نکلتی نہ تھی۔ میرے ایک دوست کے ہاں جُوا ہو رہا تھا میں نے زندگی میں کبھی جوا نہ کھیلا تھا۔ مگر یامنی کو کوئی چیز نذر کرنے کا مجھے کوئی طریقہ نہ سوجھا میں اپنے اس دوست کے یہاں جوا کھیلنے کے لئے جا پہنچا۔ جوا کھیلا کچھ میری اور کچھ یامنی کی تقدیر نے ساتھ دیا۔ میں پچاس ساٹھ روپیہ جیت کر صبح جب اپنی کوٹھڑی میں پہنچا تو مارے خوشی کے زمین پر میرے پاؤں نہ پڑتے تھے۔

دوسرے دن میں نے یامنی کو نذر کرنے کے لئے دو اعلیٰ رومال۔ ایک انگوٹھی اور کچھ خوشبودار صابن اور عطر کی شیشیاں خریدیں۔ ان سب چیزوں کو ایک چھوٹی سی صندوقچی میں بند کر کے گھر لے گیا۔ اور سوچنے لگا کہ کس طرح میں یامنی کے ہاتھوں تک اپنی نذر پہنچاؤں۔ میری نذر پہنچانے کا انجام کیا ہو سکتا ہے۔ یامنی کے بھائی اور اس کی بھاوجہ کو اگر پتہ چل گیا تو اس بیچاری پر کیا گذرے گی؟ وہ ایسے سوال تھے جو اس وقت میرے دماغ میں آئے مگر انہیں کوئی عظمت نہ دیکھی۔ اسوقت تو مجھے ایک ہی خواہش تھی اور وہ اپنی سوغات کی چیزوں کو پہنچانے کی۔ کافی دیر تک انتظار کرنے کے بعد بھی مجھے اپنی سوغات پہنچانے کا موقع نہ ملا۔ وہ تمام دن اسی طرح نکل گیا۔ یامنی کے مسکراتے ہوئے چہرے کے دیدار ہوئے مگر میری خواہش پوری نہ ہوئی۔ دوسرے دن میں کالج نہیں گیا میرے مکان کے چھت کے سامنے جو دیوار تھی اس پر کھڑے ہو کر آسانی سے کوئی چیز یامنی کو دیجا سکتی تھی اس روز دوپہر کی سنسناہٹ میں میں نے یامنی کو پکارا۔ وہ دیوار پر چڑھ گیا۔ اور صندوقچی اس کے ہاتھ میں دیدی۔

"یہ کیا ہے؟" وہ یہ کہتی ہی رہ گئی۔ اور میں چھت سے کود کر نیچے آگیا۔ لنکا کے فتح کرنے پر لچھمن جی کو جتنا سرور حاصل ہوا تھا اس سے بھی زیادہ لطف مجھے اپنی فتح پر تھا۔

میں نے اپنے شوہر کی باتوں میں دخل دیتے ہوئے کہا۔ اگر اسی طرح ہر ایک واقعہ کا آپ ذکر کرتے رہیں گے تو آپ کی داستان محبت ایک مکمل ناول بن جائیگی رات بھی زیادہ گذر چکی ہے اس لئے ذرا مختصر الفاظ میں بیان کریں۔ یہ تو میں سمجھ رہی ہوں کہ یامنی کی داستان محبت سنانے میں آپ کو بیحد لطف ہو رہا ہے مگر باقی داستان مختصر طور پر بیان کریں تو بہتر ہے۔

وہ بولے اب اور کچھ سنانا باقی نہیں ہے۔ دوسرے دن ہی تو سب راز فاش ہو گیا یامنی کی بہن کو میں نے کوئی چیز نذر نہیں کی تھی اس باعث یا کسی اور وجہ سے اس نے یامنی کے بھائی سے سب کچا چٹھا کھول دیا اور اپنی طرف سے کچھ نمک مرچ بھی لگادی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دوسرے دن اس کے بھائی نے آکر مجھے بُری طرح پھٹکارا لعنت ملامت کی۔ اور اسی دن شام کو وہ اس مکان کو چھوڑ کر چلا گیا۔ میں نے بہت کچھ جستجو کی۔ مگر یہ پتہ نہیں چلا کہ وہ کہاں چلا گیا میری محبت کی بلو شاہت اس طرح ایک بار بس کر اجڑ گئی۔

میں نے دیکھا ان کی پیشانی پر رنج کی لکیریں تھیں انکے چہرے پر ملال تھا اور میرے چہرے پر غم

ازدواجی محبّت

گھریلو زندگی کی اصلی راحت خاوند بیوی کی محبت سے ہی ظاہر ہوتی ہے۔ اگر خاوند بیوی میں باہم محبت نہیں ہے تو گھریلو زندگی کا سکھ غائب ہو جاتا ہے۔ جب ہم "ڈال ڈال تم پات پات" والی بات ہو جاتی ہے۔ تو محبت کی جگہ نفرت لے لیتی ہے۔ راحت اور تسکین کی جگہ لڑائی فساد اور بے امنی کی بادشاہت قائم ہو جاتی ہے۔ میرے شوہر نے جب سے اپنی مالی حالت کا پورا پتہ مجھے دے دیا تھا۔ تب سے میں نے اپنا خرچ بہت کم کر دیا تھا۔ لپ اسٹک اور پاؤڈر کا استعمال تو میں پہلے ہی بہت کم کرتی تھی مگر گھر کی مالی حالت جان لینے کے بعد میں نے ان چیزوں کا استعمال بالکل بند کر دیا۔

انہی دنوں میرے پڑوس میں ایک ایسا واقعہ ہوا جس سے محلہ بھر میں تھلکہ سا مچ گیا سب لوگوں کے منہ سے یہی بات نکلتی تھی کہ شاردا چرن نے یہ اچھا نہیں کیا۔ بات یہ تھی کہ میرے پڑوس میں شاردا چرن نامی ایک صاحب رہتے تھے وہ گاؤں کے مردوں میں سب سے زیادہ تعلیم یافتہ تھے۔ وہ بمبئی میں ملازم تھے۔ انگریزی ایسی اچھی بولتے تھے کہ ان کی انگریزی کی دھاک بندھی تھی۔ گاؤں میں تحصیلدار صاحب آتے یا تھانے دار صاحب تشریف لاتے۔ تو بابو شاردا چرن کو سب سے پہلے بلایا جاتا۔

اس کی وجہ یہ تھی شاردا چرن بڑے ملنسار تھے ضلع کے تمام رئیسوں سے ان کا گہرا تعلق تھا۔ وہ کانگریس کے کٹر پیرو تھے اور ساتھ ہی ساتھ گیتا کے عالم بھی جب کبھی گھر پر آتے تو دوپہر کے وقت گاؤں کی بوڑھی عورتوں اور بیواؤں کو وہ درگاہ سپت شتی نیز گیتا سنایا کرتے۔

گاؤں میں شاذ ہی کوئی ایسا شخص ہوگا۔ جو پنڈت شاردا چرن کے آنے پر ان سے ایک بار ملاقات نہ کر آتا ہو۔ ان کا پوجا پاٹھ میں کافی وقت لگتا تھا۔ ان سب باتوں کا

مطلب یہ نہیں کہ شاردا چرن کنوارے یا غیر شادی شدہ تھے۔ ان کی شادی میری شادی ہونے سے تین برس پیشتر ہو چکی تھی۔ ان کی بیوی حسین کہی جاتی ہے۔ میں نے انہیں کبھی دیکھا نہیں۔ مگر گاؤں کی مستورات گاہے بہ گاہے شاردا بابو کی بیوی کی خوبصورتی کی تعریف کیا کرتی تھیں۔ میری ساس جس طرح مجھ سے ناخوش رہا کرتی تھی۔ اسی طرح شاردا چرن کی ماں اپنے لڑکے کی بیوی سے ناراض رہا کرتی تھی۔ کبھی کبھی ان لوگوں میں ہاتھا پائی بھی ہو جایا کرتی تھی۔ گاؤں میں جب کہیں ساس بہو میں جھگڑا ہوتا ہے تو آس پاس کی عورتیں تماشہ دیکھنے کیلئے جمع ہو جایا کرتی ہیں۔ ان عورتوں کے ذریعہ لڑائی جھگڑے کی خبر تمام لوگوں کو معلوم ہو جاتی ہے ایسی عورتوں سے میں نے سنا تھا کہ شاردا چرن اپنی بیوی کو محبت کرتے تھے لیکن ماں کے فرماں بردار فرزند ہونیکے باعث وہ اپنی ماں سے کچھ بھی نہ کہتے تھے۔ ایکبار تو انکی ماں نے بہو کے سر کو چولھے میں دیدیا تھا۔ اسکے آدھے سے زیادہ بال جل گئے تھے

تھوڑے دنوں کے بعد میں نے تلیا سے سنا کہ شاردا بابو اپنی بیوی کو اپنے ہمراہ بمبئی لے گئے۔ اپنی بیوی کو اپنے ہمراہ لے جانے سے پیشتر شاردا چرن ہر ماہ پچاس روپیہ اپنے والد صاحب کو بھیجا کرتے تھے لیکن بیوی کو لیجانے کے بعد انہوں نے ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں بھیجی۔ ان کی ماں ایک دن میرے گھر پر آئی۔ میری ساس اور ان کے درمیان جو بات چیت ہوئی اسے میں اپنے کمرے میں بیٹھی سنتی رہی۔ باہر آنے کی اجازت نہیں تھی ایک بار ان کے پاؤں چھونے کے لئے ساس جی نے بلایا تھا۔ پاؤں چھونے کے بعد ساس جی کے ارشاد کے مطابق میں پھر اپنے کمرے میں واپس چلی گئی پنڈت شاردا چرن کی ماں نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا کتنی تکلیفوں سے شاردا کو لکھایا پڑھایا۔ اب وہ بیوی والا ہو گیا ہے۔ ماں باپ اس کے کوئی نہیں رہے آج کل یہ چھوکری مالکن ہو گئی میری ساس نے ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا یہ کلجگ ہے اس میں جو نہ ہو جائے وہی تھوڑا ہے آج کل یہ بہوئیں جو نہ کریں وہی کم ہے یہ کہنے کی ضرورت نہیں۔ کہ یہ الفاظ میرے لئے ہی استعمال ہوئے تھے سینما اور بائیسکوپوں میں رات گنوانے والے تبرز قاصداؤں کے قدموں کی خاک پیشانی

میں لگا کر اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھنے والے پردیس میں برسوں رہنے والے فرقت زدہ مستورات کے دلی درد کو نہیں سمجھ سکتے۔ وہ اپنی ہی دھن میں مست رہنے والے یہ نہیں جانتے کہ ان کی بیویاں ان کی آمد کی انتظار میں کتنی پریشان اور بیتاب رہتی ہیں۔ کس طرح ان کا ایک ایک دن ایک ایک برس کی مانند بسر ہوتا ہے۔ ہاں تو شاردا چرن ایک برس بعد چھٹیوں میں گھر آئے۔ تمام گاؤں میں ان کا ذکر ہونے لگا۔ تذکرے کا مضمون تھا شاردا بابو کی بیوی کا ترک پردہ۔ کہتے ہیں کہ وہ گھر میں کیا باہر بھی کسی سے پردہ نہ کرتی تھی۔ ایک دن سنا کہ شاردا چرن کے والد صاحب جب بیٹھک میں بیٹھے ہوئے اپنے لڑکے سے بات چیت کر رہے تھے اس وقت شاردا چرن کی بیوی کمرے میں آگئی اور خسر کی موجودگی کا خیال نہ کرتے ہوئے بولی پنڈت جی! میں اپنی ساڑھی میں یہ بیل لگا لوں!" تلسیا کہتی تھی کہ بوڑھے جانکی ناتھ بہو کا یہ چلن دیکھ کر شرم کے مارے سر جھک گیا۔ اور وہ وہاں سے اٹھ کر باہر چلے گئے۔

کچھ دنوں تک گاؤں میں شاردا چرن اور ان کی بیوی کا خوب تذکرہ ہوتا رہا۔

شاردا چرن کچھ دنوں تک بمبئی میں رہے۔ ان کی بیوی حاملہ ہونے کے باعث اپنے میکے چلی گئی۔ اس کے کچھ ہی دنوں بعد شاردا چرن کا ایک اور خط آیا جس میں انہوں نے دنیا سے تعلق چھوڑ دینے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ اس کے تین دن بعد ہی شاردا چرن کا ایک اور خط آیا جس میں انہوں نے اپنے والد صاحب کو لکھا تھا کہ "کون کس کا ہے؟ سب دنیا غرض کے پیچھے دیوانی ہے۔ میں اس خود غرض دنیا سے اتنا اکتا گیا ہوں کہ میں اب اپنے کسی رشتہ دار کا منہ نہیں دیکھنا چاہتا" میرے شوہر کے نام بھی ان کا ایک خط آیا تھا

گھر کی ایک الماری میں کچھ کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ ان میں سے میں نے قصہ طوطا مینا نکال لیا۔ آٹھ دن میں میں نے کتاب ختم کر دی۔ کتاب نے میرا دماغ اتنا پراگندہ کر

دیا۔ کہ میرا مردوں پر سے اعتماد اٹھ گیا۔ اسی دوران میں میں نے چیخوف بھٹیاری وغیرہ کئی کتابیں پڑھیں ان کتابوں نے میرے اوپر بڑا بُرا اثر ڈالا۔ میں سوچنے لگی۔ کہ مرد بڑے خود غرض ہوتے ہیں۔ وہ اپنی خود غرضی اور نفسانی جذبات کی سیری کے لئے عورتوں کو ہمیشہ اپنا غلام بنائے رکھتے ہیں۔ اسی دوران میں میرے شوہر آٹھ دن کے لئے ایک برات میں منصوری گئے۔ اور بیس دن تک واپس نہ آئے۔ ان کی اس غیر حاضری کا میں نے فوراً یہ مطلب نکالا کہ وہ ضرور ہی کسی کی محبت میں پھنس گئے ہیں۔ نہیں تو بھلا کوئی اپنی نئی شادی شدہ بیوی کو بھول سکتا ہے؟ اسوقت میں سوچتی۔

؎ خود پنچھی بن سکوں اگر تو کیا کچھ دیر لگاؤں۔
میں اپنے کو آپ مٹا کر جاکر اُن کو لاؤں۔

علم وادب اور شاعری کا تذکرہ جانے دیجئے۔ ہماری سوسائٹی میں ایسے سنگ دل شوہروں کی کمی نہیں ہے جو دو دو تین تین سال کلکتہ اور بمبئی میں گذار کر واپس گھر آتے ہیں۔ خود عیش وعشرت میں غلطاں رہتے ہیں۔ اور امید رکھتے ہیں۔ کہ ان کی بیویاں عصمت مآب سیتا اور ساوتری کی مانند اپنی زندگی بسر کریں گی۔ ہندوستان کی اس پاک سرزمین میں ایسی مستورات کی کمی نہیں ہے جو شوہر کے استقبال کے انتظار میں ایک دو سال تو کیا بلکہ اپنی تمام زندگی گذار دیتی ہیں مگر مرد اپنے اس قسم کے نارواسلوک سے باز نہیں آتے۔

پورے بیس دن کے بعد میرے شوہر گھر واپس آئے۔ اس دوران میں میں نے دو تین خطوط بھی لکھے مگر ان کا مجھے کوئی بھی جواب نہیں ملا۔ میرا شک بڑھتا ہی گیا پہلے وہ جب کبھی گھر آتے تھے۔ تو رات دن گھر ہی میں بیٹھے رہتے تھے۔ تھوڑی دیر کے لئے باہر جاتے اور پھر گھر میں آجاتے۔ مگر اس دفعہ وہ بات نہ تھی۔ اس مرتبہ ان کی بھویں تنی رہتیں۔ کسی سے اچھی طرح بات نہیں کرتے تھے۔ ذرا ذرا سی بات پر جھڑک دیتے

ان کے سلوک سے میرا یہ خیال اور بھی پختہ ہوتا جاتا تھا۔ کہ ضرور ہی ان کا کسی دوسری عورت سے ناجائز تعلق پیدا ہو گیا ہے۔ وہ بات بات میں کہنے لگتے کہ عورت ذات ہی ایسی ہے

ایکدن میں نے ان سے کہا کہ اگر تم کسی وجہ سے مجھ سے ناراض ہو تو وہ وجہ مجھے کیوں نہیں بتلا دیتے جس سے میں اپنے آپ کو سدھارنے کی کوشش کر دوں اگر اور کچھ نہ کر سکو تو دو چار مہینے کے لئے مجھے میکے بھیجدو۔ میں یہاں کس کی ہو کر رہوں؟ آپ نہ اچھی طرح بولتے ہیں اور نہ بات کرتے ہیں۔

میرے ان الفاظ نے ان کے دل پر گہرا اثر کیا۔ میں نے ان کے چہرے پر بے اعتمادی کی جھلک دیکھی عورت ذات اسی قابل ہے۔ ان کے منہ سے یہ الفاظ آدھے نکلے اور آدھے منہ ہی میں رہ گئے میرا کلیجہ دھک دھک کرنے لگا میں انکی قمیض کا سرا پکڑ کر رہ گئی انہوں نے ایک خط میرے سامنے پھینکدیا اور یہ کہہ کر باہر چلے گئے کہ عورت ذات پر اب مجھے کوئی اعتماد نہیں ایسی بدگمان عورت ذات کا منہ تک دیکھنا نہیں چاہتا

میری حالت عجب تھی۔ وہ تو کمرے کے باہر ہو گئے مگر میں صم بکم بنی سامنے ایک خط پڑا ہوا تھا۔ اور اسی کے پاس شاردا چرن کی ایک چھوٹی سی تصویر بھی۔

جسطرح میرا دل شک سے بھر گیا تھا بعینہٖ اسی طرح انکے دل میں بھی شک نے گھر کر لیا تھا وہ جو خط مجھے پڑھنے کیلئے دیگئے تھے اسمیں یہی لکھا تھا کہ کسطرح شاردا چرن کی بیوی نے کسی دوسرے مرد کی محبت میں گرفتار ہو کر اپنے شوہر کی عزت و آبرو کو خاک میں ملا دی۔

کس طرح شوہر کو مجبور ہو کر سنیاس دھارن کرنا پڑا۔ میں اب اپنے شک کو تو بھول گئی اور ان کے شک کو مٹانے کے لئے کوشش کرنے لگی۔

رات کو جب وہ آئے تو میں نے کہا۔ آپ بھی پڑھ لکھ کر ایسے ہی رہے۔ کیا تمام مستورات اسی طرح کی ہوتی ہیں۔ دنیا میں نیک بھی ہوتے ہیں اور بد بھی اگر ایک بُرے آدمی کے باعث تمام دُنیا کو بُرا کہا جائے تو یہ عقلمندی کی بات نہ ہوگی۔

میری اس بات سے جیسے انہیں کچھ سمجھ آگئی۔ میں نے دوبارہ کہا۔ دیکھو اس

طرح بے وجہ غصہ اور شک کرنا انصاف کی بات نہیں ہے۔

"کہیں تم نے بھی مجھے اسی طرح کسی دن دھوکا نہ دینا" یہ کہتے کہتے وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ ان کے اس بھولے پن پر مجھے ہنسی آگئی۔ میں نے ان کے آنسو اپنے آنچل کے سرے سے پونچھے۔ انہوں نے میرے گلے میں باہیں ڈالتے ہوئے کہا "میری پریما!" میں نے کہا "میرے محبوب!"

پھر کالج میں

دو مہینے سسرال میں رہ کر میں پھر گھر چلی آئی۔ کالج کا پھر شروع ہو گیا میرے شوہر نے مجھ سے کئی بار پوچھا۔ اور اپنی قسم دے کر پوچھا کہ کیا میں نے کبھی کسی نوجوان سے محبت کی ہے۔ مگر میں نے صاف انکار کر دیا۔ لڑکپن میں دو ایک شخصوں کی محبت کا ذکر کیا۔ مگر میں نے انہیں صاف طور سے نہیں بتلایا کہ کالج کے دروازے پر کوئی نوجوان مہینوں سے میرے فراق میں دیوانہ ہے۔ اور نہ جانے کیوں میری کشش بھی اس کی طرف بڑھتی جاتی ہے۔ میرے شوہر نے میری پاکیزگی اور سچائی پر اعتبار کر لیا۔

پہلے دن شادی کے بعد جب میں کالج میں پہنچی تو لڑکیوں نے بُری طرح سے بنانا شروع کر دیا۔ ایک بولی ---- ---- یہ جگہ خالی کرو۔ دیکھتی نہیں ہو۔ شریمتی شری داستو یہ تشریف لا رہی ہیں۔

دوسری نے ایک لمبا سلام ٹھونکتے ہوئے کہا "شریمتی جی کو خوش آمدید"

تیسری بولی "بہن پریا اودہ کیسے ہیں"

چوتھی بولی "وہ کون ہیں؟"

ایک نے کہا۔ وہ ان کے رسیلے رسیا۔ جو انہیں لیکر ایسے گھر میں داخل ہوئے کہ دو مہینے تک باہر ہی نہ نکلے۔

چندرا دوسرے گوشے پر تھی۔ اس نے وہیں سے کہا اب ہمیں کون پوچھتا ہے جس کی شادی ہو جاتی ہے۔ اس کا دماغ تو ساتویں آسمان پر پہنچ جاتا ہے۔

میں نہایت پریشان تھی۔ خواہش ہوتی تھی۔ کہ کہیں بھاگ کر ان لوگوں سے پنڈ چھڑاؤں۔ مگر میری بھگوان نے حفاظت کی۔ پروفیسر صاحب تشریف لے آئے جس سے لڑکیوں کی زبان بند ہو گئی۔

اس دن لڑکیوں نے دن بھر مجھے بنایا۔ چندرا آخری گھنٹے میں میرے ہی پاس آکر بیٹھ گئی۔ اس نے کہا۔ تمہارے مجنوں صاحب تمہارے بنا بے چین ہیں۔ بیچارے روزانہ چکر کاٹتے ہیں۔ ان کی زرد موٹر نہ جانے کالج کے کتنے چکر کاٹتی ہے کسی سے کچھ پوچھ بھی نہیں سکتے ایک مرتبہ دل میں آیا کہ کہہ دوں کہ چڑیا اڑ گئی۔ اس نے الگ گھونسلہ بنا لیا ہے مگر لوگ کیا کہیں گے یہی سوچ کر چپ رہی۔

چندرا کی بات چیت سے اس نوجوان کی دلکش مورت ایک لمحہ کے لئے میری آنکھوں کے سامنے ناچ گئی۔

"کتنا بھولا ہے اس کا چہرہ!" میں نے دل ارادوں کو دباتے ہوئے چندرا سے کہا۔ بہن چندرا! نہ جانے یہ موا کیوں میرے پیچھے پڑا ہے؟"

"اپنے دل سے پوچھو"

"اپنے دل سے کیا پوچھوں؟ میں تو اس سے بات بھی نہیں کرتی"

"مگر تمہاری آنکھیں اور تمہارا دل تو کچھ ضرور کہتا ہے"

"بہن اب میں بڑی مشکل میں پڑی ہوں۔ اگر کہیں ان کے کانوں تک یہ بات پہنچ گئی تو میں کہیں کی نہ رہوں گی۔ تو کوئی ایسا طریقہ بتا جس سے اس بلا سے پنڈ چھوٹے"

"پنڈ چھڑانا آسان نہیں ہے۔ اور خاص طور سے تب جب تیرے دل میں بھی گنجائش ہے"

میرے دل میں گنجائش ہے؟ تو کہتی کیا ہے؟ ایشور جانتا ہے۔ اگر میرے دل میں کسی طرح کی کوئی بات ہو؟"

"ایشور بھی جانتا ہے۔ اور میں بھی جانتی ہوں مگر یہ آثار اچھے نہیں۔ اب تو کسی طرح اس سے پنڈ چھڑا ورنہ کہیں کی نہ رہیگی۔ اگر تیرے شوہر نے تجھ کو چھوڑ دیا۔ تو دنیا میں ٹھہرنے کے لئے بھی تیرے لئے کوئی جگہ نہیں رہے گی۔

اس دن کالج سے جب میں گھر واپس آئی تو میرا عجیب حال تھا۔ میں یہ فیصلہ نہ کر سکی کہ اب آخر مجھے کیا کرنا چاہیئے۔ اس دن نوجوان مجھے نہیں دکھلائی دیا۔ میں نے سوچا شاید اب اسے معلوم ہو گیا ہو گا۔ کہ میں اس کالج میں نہیں پڑھتی۔

میں چھت پر چڑھ گئی اور سوچنے لگی۔ کہ اگر کہیں اس نوجوان کے ساتھ میرا رشتہ محبت قائم ہو جائے اور ہمارے یہ تعلقات کافی عرصہ تک قائم رہیں تو اس کا کیا انجام ہو گا؟ اگر مرد کسی بھی نازنین کو محبت کر سکتا ہے۔ تو کیا باعث ہے کہ کوئی نازنین کسی نوجوان سے اظہار محبت نہ کرے۔ وہ نوجوان میرے عشق میں دیوانہ ہے۔ میں یہ کیسے کہہ سکتی ہوں کہ اس کی محبت نفسانی جذبات سے لبریز ہے۔ کیا نوجوان اپنی بہن کو پیار نہیں کرتے کیا وہ اپنے بھائی کی بیٹی کو پیار نہیں کرتے۔ مگر پیار کا مطلب محض۔ نفسانی جذبات کی سیری نہیں ہو سکتا یہ کیسے کہا جا سکتا ہے۔ کہ اس کی محبت میں نفسانی جذبات نہاں ہیں۔ ہو سکتا ہے۔ کہ اس کی محبت بے غرض ہو۔ ہو سکتا ہے کہ اس کی بہن میری ہی طرح ہو۔ اس مرتبہ اگر میری اس سے ملاقات ہو تو میں ضرور ہی اس سے دو باتیں کروں گی ایک لمحہ میں میں یہ سب باتیں سوچ گئی۔

عین اس وقت سامنے سڑک پر موٹر کا ہارن بجا۔ میں نے حیرت سے دیکھا اسکی وہ زرد موٹر بہت سست رفتار سے چلی جا رہی ہے وہ خود موٹر چلا رہا تھا اور اس کے پہلو میں ایک نازنین بیٹھی تھی۔ میرے دل میں ایک بجلی سی دوڑ گئی۔ اس نے بھی میری طرف دیکھا اور میں نے بھی اس کی طرف نظر ڈالی۔

دل کی حالت درست رکھنے کے لئے میں نیچے اتر آئی۔ اور اپنے کمرے میں آکر ایک کتاب کے ورق الٹنے لگی۔

مسٹر مجنوں

اس دن کے بعد وہ نوجوان پھر مجھے کالج سے آتے جاتے ملنے لگا۔ اس کے ظاہری لباس اور زرد موٹر کار سے یہ بات تو مجھے بخوبی معلوم ہو گئی کہ وہ کسی اعلیٰ خاندان کا فرد ہے مگر میں اس کا خاص حسب نسب جاننے کے لئے بیتاب تھی۔ ایک دن جماعت میں بیٹھے بیٹھے میں نے ایک پرزہ کاغذ پر لکھا "جناب اس طرح پاگلوں کی مانند کسی شریف لڑکی کے پیچھے گھومنا شرافت کا کام نہیں ہے۔ آپ کے ساتھ میں نے ایک نازنین کو کئی بار موٹر پر بیٹھے دیکھا ہے۔ اگر آپ اپنا پورا حسب نسب بتلا سکیں تو بہتر ہوگا۔ ورنہ کبھی راستے میں مجھ سے ملنے کی کوشش نہ کریں۔ میں یہ بھی جاننا چاہتی ہوں کہ آپ کے ساتھ والی لڑکی کون ہے۔ اور اس کا آپ سے کیا تعلق ہے؟ سب حالات مختصر الفاظ میں بیان کریں۔ مشکور رہوں گی۔

میں نے یہ پرزہ لکھ کر اپنی قمیض کی جیب میں رکھ لیا۔ کالج کی چھٹی ہونے پر وہ نوجوان مجھے راستے میں ملا۔ کچھ دور جا کر میں نے چاروں طرف دیکھ کر وہ کاغذ اپنی قمیض کی جیب سے نکالا اور اسے دے دیا۔ وہ حضرت اسے وہیں پڑھنا چاہتے تھے مگر میں نے ڈانٹ کر کہا راستے میں مت پڑھیئے۔ کہیں فرصت میں پڑھ لینا۔ یہ کہہ کر میں آگے بڑھ گئی اور وہ پیچھے لوٹ گئے۔

رات بھر مجھے بڑی بیچینی رہی۔ کبھی سوچتی میں نے بے فائدہ ہی اس نوجوان کو خط لکھ دیا۔ اگر کہیں خط میرے شوہر کے ہاتھوں میں پہنچ جائے؟ اور دوسرے ہی لمحہ سوچتی شوہر کے ہاتھوں میں کیسے پہنچ جائے گا وہ تو یہاں سے بہت دور دوسرے شہر میں مقیم ہیں۔ اور پھر میں نے انہیں کونسا اپنا نام لکھا ہے۔ خود اور دستخط کس کے پہچاننے بیٹھتا ہے۔

دوسرے دن کالج کے پھاٹک کے باہر ہی دس بارہ سال کا ایک لڑکا مجھے ایک لفافہ دے کر بھاگ گیا۔ میں نے اس لفافے کو پھاڑ کر اس کے کاغذ اپنی قمیض کی جیب میں رکھ لئے۔ انہیں پڑھنے کے لئے میں کتنی بیقرار تھی۔ اس کا گمان کوئی عاشق مزاج ہی لگا سکتا ہے۔

میں نے خط ایک کاپی میں رکھ لیا تھا۔ جونہی تواریخ کا گھنٹہ آیا۔ اور پروفیسر کا لیکچر شروع ہوا میں نے خط پڑھنا شروع کر دیا۔ اس میں لکھا تھا۔

عزیز از جان .....

میں تمہیں کیا لکھ کر مخاطب کروں۔ مہینوں گذر گئے مگر میں ابھی تک آپکی نظر عنایت کا متلاشی بنا ہوا ہوں۔ خواہ آپ مجھے کتنی ہی لعنت ملامت کریں مگر میرے دل سے آپ کی تصویر کبھی دور نہیں ہو سکتی۔ میں اپنا حسب نسب آپ کو کیا بتلاؤں سنا ہے آپکی ہم جماعت کچھ لڑکیاں مجھے مجنوں کہا کرتی ہیں۔ اور یہ نام شاید میرے لئے بہت موزوں بھی ہے۔ آپ کے لئے مجنوں بننے میں بھی کچھ عذر نہیں ہے۔ میں نے ایک ناول لکھنے کا ارادہ کیا ہے۔ اس کے کچھ باب لکھ بھی ڈالے ہیں۔ اس ناول کا ہیرو میں ہی ہوں۔ اگر میں کی جگہ ہیرو کا نام لکھ دیا جائے۔ تو آپ کو میرا حسب نسب معلوم ہو جائے گا۔ آپ نے میرے ساتھ جس لڑکی کو دیکھا ہے اس کا بھی اس ناول میں ذکر ہے۔ اس کا نام جس را جکماری تو نہیں ہے۔ مگر ہے وہ میری رفیقہ اور اگر ممکن ہوا تو ایسی رفیقہ جیسے مستقبل میں کبھی زندگی کی رفیقہ کہہ کر مخاطب کیا جا سکیگا۔

اس کے بعد ناول کا باب اس طرح شروع ہوا۔ عورتوں کے پیچھے دنیا میں نہ جانے کتنے گناہ ہوئے کتنے ظلم ڈھائے گئے۔ کہا نہیں جا سکتا۔ مگر عورتوں کے لئے مردوں کی کشش کبھی کم نہیں ہوئی کالج کے دنوں میں بائیسکوپ دیکھنے کا ایسا چسکہ لگا۔ کہ

پڑھنے سے زیادہ ہائیسکوپ دیکھنے کی ضرورت معلوم دینے لگی۔ کسی ایکٹرس کے کس عضو میں کیا کشش ہے۔ اس پر ہم لوگ گھنٹوں تک بات چیت کیا کرتے۔ کیوں کرتے تھے۔ اس کا باعث سوائے عورتوں کی قوت کشش کے اور کچھ نہ تھا۔

امتحان ختم ہو چکے تھے۔ ہوسٹل کی تمام چڑیا اڑ چکی تھیں۔ دو چار ہم جیسے آرام طلب انسان امتحان کی خماری اتارنے کے لئے رہ گئے تھے۔ میں چلا بھی جاتا۔ مگر مس راجکماری نے دو دن اور ٹھہر جانے کے لئے مجبور کیا۔ لکھنؤ یونیورسٹی کا گریجوایٹ۔ بھلا یہ گستاخی کیسے کر سکتا تھا۔ کہ وہ ایک تعلیمیافتہ عورت کی بے عزتی کر سکے۔ اس کی حکم عدولی کر سکے۔

زندگی کا اگر کہیں مزا ہے تو وہ ہوسٹل کی زندگی میں ہے۔ لیکن اسی حالت میں جب خرچ کی کمی نہ ہو۔ پرماتما کی نظر عنایت سے اپنے رام تو ایسے گھر میں پیدا ہوئے جس میں شاید سات پشتوں سے کوئی خرچ کرنے والا پیدا ہی نہ ہوا تھا۔ جمع کرنے والوں نے اتنا جمع کر لیا تھا؟ کہ بنک والے خوب فائدہ اٹھا رہے تھے۔ ہمارا خرچ ہی کیا تھا؟ مشکل سے چار یا پچسو روپیہ۔ کھانے پینے میں تو برائے نام خرچ تھا۔ مگر سیر و سیاحت میں جی کھولکر خرچ ہوتا تھا۔ اگر کہیں ٹی پارٹی (دعوت چائے) ہوئی اور یہ معلوم ہوگیا کہ لڑکیاں بھی اس میں شامل ہونگی تو پھر اپنا لکھنا پڑھنا چار دن پہلے سے ہی بند ہو جاتا تھا۔ دعوت میں کونسا سوٹ پہنکر جاؤں گا۔ کون سی ٹائی فٹ ہوگی۔ کونسا جوتا ٹھیک رہیگا۔ یہی سوچتے سوچتے دن گذر جاتا تھا۔ کبھی کبھی رات میں کمرے کے دونو دروازے بند کر میں سوٹ پہنتا۔ ٹائی لگاتا اور پھر آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھتا۔ سوٹ پر نظر ڈالتا۔ اگر سوٹ میں ذرا سی شکن بھی دکھلائی دیتی تو اس سوٹ کو اتار کر دوسرا سوٹ پہنتا۔ غرض یہ کہ جب تک مجھے یہ اطمینان نہ ہو جاتا کہ یہ سوٹ خوب جچے گا تب تک اپنا سوٹ پہننے اور اتارنے کا کام جاری رہتا۔ کبھی کبھی تو سوٹ کے اتارنے پہننے میں تمام رات ختم ہو جاتی تھی۔ جناب یہ میری خوش قسمتی اور فیشن پرستی

کا ہی نتیجہ تھا۔ کہ جس مس راجکماری سے دو باتیں کرنے کے لئے میرے ہم جماعتی بیتاب رہتے تھے وہ مجھ سے اس طرح گھل مل کر رہتی تھی جیسے وہ میری ہی ہو۔

مس راجکماری کو البشور نے لاثانی حسن تو دیا ہی تھا۔ مگر اسکی گفتگو ایسی شیریں تھی کہ میں کیا کہوں؟ اگرچہ وہ بی۔اے پاس کرتے کرتے عالم شباب کا بیشتر حصہ گذار چکی تھی۔ مگر اس کے منور رخ انور کو دیکھ کر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا۔ کہ اس کی عمر ۲۵ برس کی ہوگی۔ بڑی بڑی آنکھوں میں وہ غضب کی مستی تھی۔ کہ بہاری کا

سے " یہ نین ہلاہل مد بھرے "

یہ مصرعہ آناً فاناً زبان پہ آجاتا تھا۔ حسن اور جوانی کے ساتھ ہی ساتھ تعلیم نے انکی خوبصورتی میں چار چاند لگا دیئے تھے۔ جو کوئی دیکھتا وہی شیدا ہو جاتا۔ میں سچ کہتا ہوں کہ ان میں میں نے جو خوبصورتی پائی وہ کسی شاعر کی تصور کردہ خیالی نازنین میں بھی نہ پائی ہوگی۔

والد صاحب کو راہی ملک عدم ہوئے کافی عرصہ گذر چکا تھا۔ گھر کی دیکھ بھال کا سب بوجھ بڑے بھائی صاحب کے کندھوں پر تھا۔ میری والدہ زندہ تھی۔ مگر بڑے بھائی کی ماں لقمۂ اجل ہو چکی تھی۔ ہم دونوں سوتیلے بھائی تھے مگر اس اسرار کو لوگ شاذونادر ہی جانتے تھے۔ بھائی صاحب کبھی خرچ کے لئے انکار نہیں کرتے تھے۔ ۷۔۸ لاکھ روپیہ سالانہ کی زمینداری تھی۔ گھر میں اور کوئی بچہ نہ تھا۔ ہمیں اگر کہا جا سکے تو اپنے رام ہی گھر کے اکیلے بچے تھے۔ لوگوں نے دو چار مرتبہ بھائی صاحب سے شکایت کی کہ میں مس راجکماری کی محبت میں گرفتار ہو کر برباد ہوا جاتا ہوں مگر بھائی صاحب کے خواب میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ میں کبھی کسی لڑکی کی محبت میں گرفتار ہو سکتا ہوں والدہ نے مجھے کئی بار شادی کر لینے کے لئے کہا بھی مگر میں نے ٹال دیا۔ ایک دو بار سگائی پختہ بھی ہو گئی۔ مگر میں نے شادی کرنے سے صاف انکار کر دیا۔

میرے اس انکار کے طرح طرح کے معنی نکالے جانے لگے۔ کوئی کہتا لڑکا لکھنؤ میں میم صاحبہ سے شادی کریگا۔ کوئی کہتا بڑے آدمی ہیں دیکھ سنکر شادی کریں گے بدشکل عورتیں کہتیں ہے بہن! دنیا میں اگر خوبصورتوں کی ہی شادی ہو تو بدشکل بیچارے کہاں جائیں۔ بھاوجہ کہتی۔ عزیز شادی خواہ کہیں کرنا مگر میم نہ لانا۔ اماں کا پتہ جاپاٹھ سب مٹی ہو جائے گا۔ مگر اپنے رام بھاوجہ کی باتوں کو مذاق میں اڑا کر باغ کا راستہ لیتے۔

لڑکوں کے سن بلوغت میں پہنچ جانے پر ان کے لواحقین شادی کے لئے اس قدر زور نہیں دیتے۔ اپنا بھی یہی حال تھا خوشی سے کھاتے پیتے اور سینما دیکھتے۔ دوستوں کے یہاں دعوت ہوتی تو دوست لڑکیوں کے ساتھ بھی کبھی گھومنے کا موقعہ مل ہی جاتا تھا اور کیا چاہیئے۔ خوشی سے گذر رہی تھی۔

مس راجکماری کے ساتھ مقررہ وقت پر حسب وعدہ ہم لوگ آگرہ کی سیر کے لئے نکل پڑے۔ یوں تو آگرہ نہ جانے کتنی بار دیکھا تھا۔ مگر اس مرتبہ کی سیاحت میں ایک عجیب سرور کا احساس ہو رہا تھا۔ ہم تین ہی شخص تھے مس راجکماری اور میں نیز ان کا نوکر راجیو۔ مس راجکماری کے والد لکھنؤ کے ایک معزز وکیل تھے۔ اور شستہ خیالات کے آدمی تھے۔ آمدنی تو خاص نہیں تھی۔ مگر ان کے بود و باش کا ڈھنگ ایسا تھا کہ کسی بھی شخص کے لئے ان کی مالی حیثیت کا پتہ لگانا بہت مشکل کام تھا۔ وہ موٹر ابھی تک نہیں خرید سکتے۔ مگر ان کے یہاں کی گھوڑا گاڑی لکھنؤ کے بڑے بڑے رئیسوں کے گھوڑے گاڑی کے مقابلہ میں بڑھ کر تھی۔ اگر کوئی کہتا وکیل صاحب موٹر خرید لیجئے تو وکیل صاحب مسکرا کر جواب دیتے: "بھیا! ہم اس سود لبشی چولے میں ہی مگن ہیں"

تعلیم کے بارے میں ان کے خیالات بہت بلند تھے۔ وہ مستورات کے مساوی حقوق کو پوری طرح مانتے تھے لڑکے کے لئے اگر پچاس روپیہ کا سوٹ بنتا تھا تو اسی دن مس راجکماری کے لئے پچاس روپیہ کی ساڑی ہی آجاتی تھی۔ اپنے لئے اگر ساٹھ روپیہ

کا چشمہ خرید اگیا۔ تو بیوی کے لئے اتنی ہی رقم کا کوئی زیور آجاتا تھا مس راجکماری کو وہ بیرسٹری کی تعلیم دلانے کے لئے ولایت بھیجنا چاہتے تھے۔ مگر مالی مشکلات کے باعث ان کی وہ خواہش پوری نہ ہو سکی۔ اس لئے آخر کار یہی فیصلہ ہوا۔ کہ پہلے مس راجکماری لکھنؤ ہیں ہی وکالت کرے۔ اس کی آمدنی اس کے نام سے بنک میں جمع ہوتی رہے۔ جب کافی روپیہ جمع ہو جائے تو اسے ولایت بھیجدیا جائے۔ عصمت کی حفاظت ولایت میں کیسے ہو سکے گی۔ یہ سوال ابھی ان کے سامنے نہیں آیا۔

ہم دونوں کی دوستی سے وکیل صاحب بہت خوش تھے۔ میں برسوں سے جس قسم کی عورت کی تلاش میں تھا۔ راجکماری درحقیقت ویسی تھی۔ مگر وکیل صاحب مجھ سے کیوں خوش تھے یہ کہہ نہیں سکتا سیر و سیاحت کی ہم لوگوں کو پوری آزادی تھی۔ ہم لوگ کب کہاں جاتے ہیں۔ کہاں رہتے ہیں۔ یہ کبھی نہیں پوچھا گیا۔ دراصل بات تو یہ تھی۔ کہ وکیل صاحب کو یہ یقین ہو گیا تھا۔ کہ ہم دونو ایک دوسرے کو محبت کرتے ہیں تعلیمیافتہ ہیں۔ ذات پات ہم لوگوں کے راستہ میں رکاوٹ نہ ڈال سکیگی۔ اس لئے شادی سے پیشتر ہی انہوں نے ہمیں سب طرح کی آزادی دے رکھی تھی۔

ہم لوگ کبھی کبھی وکیل صاحب کی کھلی چھت پر کیٹس۔ بائرن اور شیلی کے عشقیہ اشعار کا مزا چکھتے۔ اور کبھی دیوا در ہماری کے شیریں چھندوں کا لطف اٹھاتے۔ مس راجکماری کے ساتھ رہنے میں مجھے جو راحت نصیب ہوتی تھی وہ کوئی عاشق مزاج ہی سمجھ سکتا ہے۔ کالج کے دیگر طلبا اس باعث مجھ سے رشک کرتے تھے۔ کبھی کبھی رات کے گیارہ بجے ہوسٹل میں آنے پہ یار لوگ کہتے " ان کی تو پانچوں گھی میں ہیں۔"

" سر کڑاہی میں اور پاؤں چوٹھے میں۔ کیوں نہ بھائی " مسٹر شکلا ہمارک کہتے کہنے کا مطلب یہی کہ ہم دونوں کی محبت کالج کی لڑکیوں کے تذکرہ کا ایک خاص مضمون بن گئی تھی۔ اور بھائی میں ہی کیا کوئی بھی طالب علم ہو اگر کسی حسینہ کی نظر التفات اس

ہر ہو جائے۔ تو لوگ خواہ مخواہ اس سے رشک کرنے لگیں گے۔ زمانہ ایسا آگیا ہے۔ کہ لوگ دوسروں کی خوش قسمتی دیکھ کر اپنی بدبختی کا رونا رونے لگتے ہیں۔

مس راجکماری کبھی کبھی خفا ہو کر جب مجھ سے بولنا بند کر دیتی تھی تو میری پریشانی دیکھنے ہی بنتی تھی۔ میں نے دو ایک مرتبہ ارادہ کیا کہ ان کی ناراضگی کا جواب ان ہی کا ڈھنگ اختیار کر کے دونگا مگر میرا یہ عہد کبھی پورا نہ ہوا۔ دو ایک مرتبہ تو میں نے اس بات کی کوشش کی کہ دیکھیں ان کے دل میں میرے لئے درد ہے۔ یا نہیں۔ اس کی جانچ کی جائے ایک دفعہ تو وہ کام کیا کہ اگر کسی پر ظاہر کر دوں تو لوگ مجھے بیوقوف کہے بنا نہ رہیں گے مگر عاشق بیوقوف ہوتے ہی ہیں۔ اس لئے میں نے اگر بیوقوفی کی ہے تو اس پر حیرت کی کونسی بات ہے۔

تب میری راجکماری کے ساتھ دوستی تو تھی مگر اس نے خفگی کی شکل اختیار کی ہوئی تھی۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ وہ کبھی کبھی ہوسٹل میں آکر مجھے دیدار ضرور دیجاتی تھی ایک مرتبہ لارڈ بائیرن کی شاعری پر گرما گرم بحث ہو گئی جس سے وہ چڑ گئی۔ اور دو دن تک نہ تو کالج میں ہی بولی اور نہ ہوسٹل میں ہی آئی۔ میں پریشان تھا۔ اس سے بات کئے بغیر میرا دل بے چین تھا۔ میں رات کو اپنے کمرے میں آکر لیٹ گیا سوچنے لگا کہ کس طرح اس سے بات چیت کی جائے ٹرنک میں ان کے ہاتھ کے تحریر کردہ کاغذوں کا ایک چھوٹا پلندہ تھا۔ وہ نکالا اور ایک ایک کر کے سب پرزوں کو دوبارہ پڑھ گیا۔ نہ جانے وہ پرزے کتنی مرتبہ میری آنکھوں کے سامنے سے گذر گئے تھے۔ مگر اس رات کو انہیں میں نے دوبارہ پڑھا۔ اور پڑھتا کیوں نہ؟ انہیں پڑھ پڑھ کر ہی تو مجھے ڈھارس مل رہا تھا۔ وہ عشقیہ خطوط نہیں تھے۔ ان میں کسی میں لکھا تھا۔ آج شام کو کانپور چلئے گا۔ کسی میں لکھا تھا۔ آج نہ آسکی۔ تکلیف ہے۔ شام کو ملئے گا۔ کسی میں لکھا تھا۔ آج کالج کیوں نہیں پہنچے۔ وغیرہ وغیرہ۔ مگر میرے لئے یہ پرزہ کاغذ بھی

عشقیہ خطوط سے کم نہ تھے۔

ان سب پرزوں کے پڑھنے کے بعد میں مس راجکماری سے ملنے کے لئے اور بھی پریشان ہو اُٹھا۔ گھڑی میں دیکھا دس بجے تھے۔ ہوسٹل کے سب لڑکے اپنا اپنا کمرہ بند کئے پڑھ رہے تھے۔ فروری کا آغاز ہو چکا تھا۔ امتحان کو مشکل سے ایک مہینہ رہ گیا تھا سال میں ان ہی دو تین مہینوں میں تو پڑھنے کی فرصت ملتی ہے یا یوں کہیئے کہ خواہش ہوتی ہے۔ مگر مجھے تو عشق کا آزار لگ گیا تھا۔ یہاں پڑھائی لکھائی کی فکر کسے تھی۔

میں راجکماری سے ملنے کے لئے اتنا پریشان ہو گیا۔ کہ میں نے کپڑے زیب تن کئے۔ اور سائیکل نکالکر باہر رکھ لی۔ ویسے تو نوکر دو منزلہ سے سائیکل اُتار کر نیچے لیجاتا تھا مگر اس وقت نوکر کو آواز دینا میں نے مناسب خیال نہ کیا۔ ڈر تھا کہ لوگ فوراً ہی کانا پھوسی کرنے لگیں گے میرے ایک دوست مسٹر شکلا بغل والے کمرے میں رہتے تھے۔ بیچارے کی نئی شادی ہوئی تھی۔ قسمت کے زور سے آپکو ایسی بیوی ملی تھی۔ کہ ہزاروں میں ایک بس پھر کیا تھا۔ آپ کو خط لکھنے اور خط کے جواب پانے کا مرض ہو گیا جسدن ڈاکیہ انہیں بیوی کا خط نہ دے جاتا تھا اُس دن اُن کے چہرے پر اُداسی کے بادل چھائے رہتے تھے۔ میری ان کی خوب پٹتی تھی۔ وہ مذاق خوب اڑانا جانتے تھے مگر میں چڑتا نہیں تھا۔ کیونکہ وہ جانتے تھے۔ کہ میں راجکماری کو پیار کرتا ہوں۔ میں جب کبھی باہر جاتا تھا۔ ان سے کہہ جاتا تھا۔ مگر اس وقت میں نے ان سے بھی کچھ نہ کہا۔

سائیکل پر ہوا سے باتیں کرتا ہوا میں راجکماری کے مکان کے سامنے سے نکل گیا۔ مگر اندر جانے کی جرأت نہ ہوئی میں نے سڑک پر سے دیکھا اس کے کمرے کی بجلی جل رہی ہے۔ سوچا۔ وہ آرام کرسی پر لیٹی ضرور ہی قانون کی کوئی کتاب پڑھ رہی ہوگی۔ چلوں کوئی کتاب لینے کے بہانے اس کے یہاں پہنچ چلوں۔ مگر غرور نے روک دیا۔ میں نے دیکھا سائیکل پھر ہوسٹل کی طرف چلی جا رہی ہے۔

اس دن رات کو مجھے اچھی طرح نیند نہ آئی۔ صبح اُٹھتے ہی میں نے سوچا کیوں نہ بھائی صاحب کو ایک تار دے دوں کہ مجھے ہیضہ ہوگیا ہے۔ تھوڑا سا ارنڈی کا تیل پی لینے سے دو چار دست ہو جائیں گے۔ کمزوری آجائیگی۔ لوگوں کو یقین ہو جائے گا کہ مجھے ہیضہ ہوگیا ہے۔ وہ میرے ساتھ ہمدردی دکھلانے کے لئے آئیں گے۔ اجکماری بھی ضرور آئیگی۔ اس وقت اس سے بات چیت ہو جائے گی۔ اور اس کھینچ تان کا خاتمہ ہو جائے گا۔

میں نے جو سوچا تھا وہی کیا۔ دو چار مرتبہ یونہی پاخانہ کا چکر کاٹ آیا۔ منہ میں انگلی ڈال کر ایک بار قے بھی کر ڈالی۔ اور اس کے بعد ایک فارم بھر کر اپنی بیماری کے متعلق بھائی صاحب کو تار دیدیا۔ تمام ہوسٹل میں تھلکہ مچ گیا۔ وارڈن صاحب دوڑے دوڑے میرے کمرے میں آئے ڈاکٹر بلائے گئے مسوں کا تانتا لگ گیا مگر جس کے لئے یہ سب تماشا کیا گیا تھا وہ نہ آئی۔

دن بھر راجکماری کی انتظار میں میں کمرے میں پڑا رہا۔ ہر ایک آنیوالے کے قدموں کی آواز میں مجھے راج کماری کے قدموں کی آواز سنائی دیتی۔ مگر امید نا امیدی میں تبدیل ہو جاتی۔ کسی طرح وہ دن بھی گذر گیا۔ اسی رات کو بھائی صاحب۔ بھاوجہ صاحبہ اور والدہ بھی تشریف لے آئے۔ ان تین ہستیوں کے ساتھ میں نے جیسی بے انصافی کی اس کا مجھے دل ہی دل میں پشیمانی ہوا۔ تار پانے کے بعد ان لوگوں نے پانی تک نہ پیا تھا۔ گاڑی چھوٹ جانے کے باعث موٹر سے وہ لکھنؤ آئے تھے۔ میں دل ہی دل میں اپنی بیوقوفی پر نادم ہو رہا تھا۔ مگر اب غلطی ہوگئی تھی۔ اسکی درستی کا کوئی طریقہ نہ تھا۔ دو دن لکھنؤ میں رہ کر مجھے لیکر بھائی صاحب وطن کو واپس چلے گئے۔

دو ہفتے گھر پر رہ کر میں پھر یونیورسٹی میں واپس آگیا۔ مجھے راجکماری سے نفرت سی ہوگئی۔ میں نے سوچ لیا کہ اب کبھی بھی اس شوخ لڑکی سے بات نہ کروں گا۔

مگر یونیورسٹی میں پہنچتے ہی اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ میں نے سنا تمہاری طبیعت یکایک خراب ہو گئی تھی۔ میں الہ آباد سے جب واپس آئی تو سرلا سے پتہ چلا۔

میرا تمام غصہ کافور ہو گیا۔ میں دل ہی دل میں اپنے آپ کو لعنت ملامت کرنے لگا کہ دیکھو کیسی صاف دل لڑکی ہے۔ میں خواہ مخواہ اس پہ شک کرنے لگا تھا۔ اس کے بعد ہم دونوں اپنی اپنی جماعت میں جا بیٹھے۔ اور اس کے بعد ریسٹورنٹ میں چائے پینے کے لیے چلے گئے۔ وہاں بیٹھ کر ہم لوگوں نے اپنے دل کا بخار اتارا۔ میں بار بار گانے لگتا

ع ڈاکٹر کو فکر کچھ نہیں میرے علاج کی

بیکار پی رہا ہوں دوا ہسپتال کی

مس راجکماری مجھے خوش کرنے کے لئے کہتی مسٹر آپ کو وہم ہو گیا ہے۔ یہ کبھی ممکن نہیں ہے۔ کہ آپ اس طرح بیمار ہوں۔ اور میں آپ کی بیمار پرسی کے لیے آپ کے پاس نہ آؤں۔ یہ غیر ممکن ہے۔ مگر میں مندرجہ بالا شعر دوبارہ گنگنانے لگتا۔

مسٹر مجنوں کی داستان محبت یہیں جا کر ختم ہو گئی۔

کالج کا ڈرامہ

کالج کی لڑکیوں نے دیو درگا دنی کا ڈرامہ کھیلنے کا فیصلہ کیا۔ مجھے راگ اور ناچ کا معمولی علم تو پہلے ہی تھا مگر والد صاحب نے اس مرتبہ ڈرامہ میں حصہ لینے کے لئے دو سینے ناچ ایک ماہر ناچ سے مجھ کو سکھلا دئے۔ کالج میں ناٹک کی تیاریاں اتنے زور شور سے شروع ہوئیں لڑکیوں کا پڑھنا لکھنا بند ہو گیا۔

مقررہ تاریخ کو کھیل کی اطلاع عوام الناس کو دے دی گئی۔ ناٹک کا مفصل با تشریح اشتہار بھی شائع کیا گیا جس کے سب سے پہلے صفحہ پر میری تصویر تھی۔ اندر چار پانچ لڑکیوں کی اور تصاویر تھیں۔ ناٹک کی تمام آمدنی قحط فنڈ میں دیئے جانے کا اعلان پہلے ہی سے کیا جا چکا تھا۔ اس باعث ٹکٹ بہت فروخت ہوئے میرے والد اور والدہ بھی تماشہ دیکھنے کے لئے گئے۔ میرے راگ اور ناچ پر ناٹک کی کامیابی کا انحصار تھا اس باعث میرا رعب کافی تھا۔ والد صاحب کو نیز میرے خاندان کے دیگر افراد کو سب سے آگے کی سیٹوں پر بٹھایا گیا۔

ٹھیک وقت پر کھیل شروع ہوا۔ اس سے پیشتر میں کبھی سٹیج پر نہ گئی تھی اس دن جب میں ناچ کے لئے کھڑی ہوئی۔ تو ایسا جان پڑا جیسے تمام سٹیج گھوم رہے ہے۔ میں نے دیکھا سامنے ہی والد صاحب اور والدہ صاحبہ تشریف فرما ہیں میں اور بھی ہچکچاہٹ میں پڑ گئی۔ مگر ونگ میں سے کسی نے کہا۔ "دیکھو فضیحت نہ کرانا۔ ناچو اور اس طرح ناچو کہ دیکھنے والے نیم بسمل ہو جائیں" میں نے اس طرف نگاہ نہیں کی مگر شاید وہ آواز چندر اکی تھی۔

میں ناچی اور جی کھول کر ناچی۔ مجھے اپنی کامیابی کا پتہ اس وقت لگا جب سٹیج پر آکر ایک صاحب نے کہا "حاضرین! آپ لوگوں کو یہ جان کر خوشی

ہو گئی کہ ہمارے شہر کے مشہور ہمدرد قوم کنور مہیپ کمار نے شریمتی پربھا کے ناچ پر خوش ہو کر انہیں ۵۰۱ روپیہ کی تھیلی اور ایک سونے کا میڈل مرحمت فرمایا ہے۔ جسے وہ اسی وقت نذر کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی سناٹا تالیوں کی گڑگڑاہٹ سے تھیٹر ہال گونج اٹھا۔

کچھ لڑکیاں میری اس کامیابی پر حیرت کا اظہار کر رہی تھیں۔ اور کچھ حد سے جلی جا رہی تھیں۔ لیڈی سپرنٹنڈنٹ صاحبہ مجھے پکڑ کر سٹیج پر لے گئیں۔ میں نے حیرت کے ساتھ دیکھا میرے مسٹر مجنوں نے پانچسو روپیہ کے نوٹ اور ایک میڈل میرے ہاتھ پر رکھ دیا۔ سب لڑکیوں نے بھی دیکھا۔ مگر چندرا نے جس نگاہ سے مجھے دیکھا۔ اسے دیکھ کر میں سہم گئی۔

اس کے بعد کھیل پھر جاری ہو گیا۔ اور رات کے تقریباً ایک بجے ختم ہوا میں گھر واپس آئی۔ نوٹ میں نے والد صاحب کو دے دیئے۔ دل میں بڑی بےچینی پیدا ہوئی۔ سوچا میں نے کیوں ناٹک میں کام کیا۔ اور کام کیا تو پھر کسی سے کام لینے کی ضرورت کیا تھی؟ ضرور اس کی نیت خراب ہے۔ ورنہ پانچسو روپیہ دے کر وہ میری توقیر بڑھانے کی کوشش کیوں کرتا۔ میری عزت بھی کیا ہوئی۔ سب لڑکیاں تو کہہ رہی تھیں۔ کہ مسٹر مجنوں کا کیا ہے۔ سب لیلےٰ ہی کا ہے۔ وہ جس طرح ہو لیلےٰ کے پاس پہنچ جائے۔ اگر درحقیقت وہ اوصاف کا خریدار ہے اس نے واصل فن کی قدر کی ہے۔ تو مجھ سے بہتر تو انوپا کا ناچ تھا۔ اسے بھی تو یہ رقم دے سکتا تھا۔ اس نے اتنے آدمیوں کے بیچ میں مجھ پر اپنی دولت مندی کی دھاک جمانے کی کوشش کی ہے۔ میں اس کی اس دولت کی بھوکی نہیں ہوں۔ میں شادی شدہ ہوں۔ مجھے اپنے شوہر کی مرضی کے مطابق عمل کرنا چاہیئے۔ مجھے اس طرح کسی کی نذر قبول کرنے کا کیا حق ہے۔ میں کل ہی ان کے دیئے ہوئے روپے اور میڈل

واپس بھیج دوں گی۔ اور لکھ دوں گی۔ کہ مجھے ان کی ضرورت نہیں۔

دوسرے ہی لمحہ خیال آیا وہ میری غریبی پر رحم کھا کر ہی کچھ دینا چاہتے تھے۔ تو چپ چاپ دے سکتے تھے۔ روزانہ تو شیطان کی مانند میرے پیچھے پھرتے رہتے ہیں پھر اس طرح سے ہزاروں اشخاص میں مجھ پر اپنی آشنائی ظاہر کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ کالج کی سب لڑکیاں اپنے دل میں کیا کہتی ہوں گی؟ چندرا نے تو یقین ہی کر لیا ہوگا۔ کہ اب میں نے الٹا راستہ پکڑ لیا ہے۔ کیا گدھا پن کیا ہے۔ اس بھلے آدمی نے اسے نذر دینے کے لئے اور کوئی جگہ ہی نہ ملی۔ گدھا۔ کمینہ۔ نادان۔ پاجی کہیں کا اس طرح کے خیالات میں محو ہو کر سو گئی۔

جوانی کے خواب

جوانی کے دن وہ دن ہیں جب آدمی کو بنا پیئے ہوئے بیسوں گھنٹے نشہ رہتا ہے۔ چاندنی رات ہو۔ آسمان میں ماہ کامل چاروں طرف اپنی چاندنی پھیلا رہے ہوں۔ کسی دریا میں کوئی کشتی دھیمی رفتار سے بہتی چلی جا رہی ہو۔ اور اس کشتی میں عاشق اور معشوق بیٹھے گاتے ہوئے چلے جا رہے ہوں۔ ؎

"جگت میں پریم ہی پریم بھرا ہے"

بس جوانی کے دنوں میں یہی نوجوانوں اور نازنینوں کے دلی ارادے رہتے ہیں وہ اپنی آسودگیوں کے سوائے اور کسی بہتری کی نہ تو فکر ہی کرتے ہیں۔ اور نہ انہیں دنیا کی کسی دوسری چیز کی فکر ہی رہتی ہے۔

میری زندگی کی لہر بھی بعینہٖ اسی طرح بہہ رہی تھی۔ حبیب کمار میرے لئے اتنے دیوانے نہ تھے جتنی میں ان کے لئے دیوانی ہو گئی تھی۔ اب وہ میری لیلےٰ تھی اور میں مجنوں کا پارٹ ادا کر رہی تھی۔ والد صاحب نے حبیب کمار اور مجھے ملنے جلنے کی پوری آزادی دے دی تھی۔ میں جہاں کہیں جانا چاہتی۔ بلا کسی روک ٹوک کے چلی جاتی۔ ہلو گ ساتھ ساتھ سینما دیکھنے جاتے اور کافی رات گئے گھر آتے پہلے دو چار دن تو ذرا ڈر سا لگا مگر بعد میں سب جھجک جاتی رہی۔ والد نے دو ایک مرتبہ والدہ صاحب کو سمجھایا بھی کہ میرا اس طرح حبیب کمار سے ملنا ٹھیک نہیں۔ مگر والدہ صاحب نے یہ کہہ کر ٹال دیا تم تعلیم یافتہ نہیں ہو۔ اسی لئے تمہارے دماغ میں ہمیشہ شک بھرا رہتا ہے۔ تعلیم یافتہ لڑکی اور لڑکے مل جل کر نہ رہیں گے تو پھر کیا تم رہو گی۔

والد صاحب کی باتیں سُنکر والدہ چپ ضرور رہ جاتی تھی۔ مگر انہیں یہ اس طرح گھر سے باہر آنا جانا اچھا نہ لگتا تھا۔ مہیپ کمار جب کبھی کوئی چیز مجھے نذر کرتے تو والدہ کا چہرہ غصہ سے سُرخ ہو جاتا مگر والد صاحب کی وجہ سے ان کا کچھ بس نہ چلتا تھا۔ مہیپ کمار بچوں کے لئے کافی مٹھائی اور پھل لاتے تھے اس باعث وہ ہمیشہ مہیپ کمار کے آنے کی انتظار میں رہتے۔ انہیں دیکھتے ہی کہنے لگتے "مہیپ بھیا آئے مہیپ بھیا آئے" والدہ بھی ان سے باتیں کرتی تھیں مگر صرف تہذیب کے طور پر۔ اگر ان کا بس چلتا تو شاید وہ مہیپ کمار کو گھر میں بھی داخل نہ ہونے دیتیں۔

والد صاحب ہمیشہ مالی تکلیف میں رہا کرتے تھے۔ جب مہیپ کمار سے ان کی واقفیت بہت بڑھ گئی۔ تو انہوں نے مہیپ کمار سے دو ہزار روپیہ بطور قرضہ لے لئے۔ مہیپ کمار کے پاس اس وقت اتنے روپے نہیں تھے مگر وہ والد صاحب کو ناراض نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اس لئے انہوں نے کسی ساہوکار سے قرض لے کر . . . . . .

. . . . . والد صاحب کو دو ہزار روپے دیئے۔ بعد میں مجھے پتہ چلا والد صاحب کی یہ خود غرضی مجھے اچھی نہ لگی مگر میں کیا کر سکتی تھی؟

ایک طرف مہیپ کمار کے احسانوں کے بوجھ سے والد صاحب دبے ہوئے تھے۔ دوسری طرف ان کی محبت اور ریاضت کے باعث میرا دل پانی پانی ہوتا تھا۔ ایک دن گومتی کے کنارے ہم لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ بندن کا ذکر ہو رہا تھا۔ مہیپ نے کہا ہندی میں محبت پر بہت کم کتب شایع ہوتی ہیں۔

یہ آپ نے کیسے جانا۔؟

کل میں اس طرح کی ایک کتاب خریدنے کے لئے گیا تھا۔ مگر کافی تلاش کے

بعد بھی ایک بھی کتاب نہ ملی۔ ایک کتاب تھی "مشاہیر عالم کی داستان محبت"
دراصل وہ کتاب مجھے پسند آئی۔

اس میں کیا ہے؟

اس میں محبت کے پیچھے سلطنت برطانیہ کا تخت چھوڑنے والے ڈیوک آف ونڈسر کی داستان محبت ہے۔ اور بھی اس طرح کے کئی محبت کے دیوانوں کی سچی کہانیاں درج ہیں۔

——— "اچھا میں پڑھونگی"

ایک جلد میں لے آیا ہوں۔

یہ کہہ کر انہوں نے اپنے کوٹ کی جیب سے ایک کتاب نکالی کتاب کے سرورق پر ڈیوک آف ونڈسر اور ان کی معشوقہ کی خوبصورت تصویر تھی۔ میں اس کتاب کے ورق اُلٹ ہی رہی تھی کہ مہیپ کمار بولے "پریمیا! اگر اسی طرح ہم لوگ بھی اپنا سب کچھ چھوڑ کر کہیں ایسی جگہ چلے جائیں۔ جہاں ہمیں جاننے والا کوئی نہ ہو تو کیا؟"

——— "یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے مہیپ! مرو کہہ تو سکتے ہیں وہ کر نہیں سکتے"

——— "کیا تم کو مجھ پر اعتبار نہیں پریمیا!"

——— "مجھے تم پر بے اعتمادی نہیں۔ مگر یہ تو دنیا کی ظاہرہ بات ہے لوگ ادھ کھلی کلی کو دیکھ کر حسرت بھری نظر سے اسکو دیکھتے ہیں۔ مگر جب جوبن پر آنے کے بعد کلی مرجھانے لگتی ہے۔ تو لوگ اس کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے"

——— "میں تمہارے لئے دنیا چھوڑ سکتا ہوں پریمیا!"

——— "عشق کی پہلی جھونک میں آدمی جو چاہے کہہ سکتا ہے مگر اس کا نبھانا مشکل ہے۔ ابھی تمہارے منہ سے جو کچھ نکل رہا ہے وہ تم نہیں کہہ رہے۔ بلکہ

تمہارے دل میں چھپا ہوا نفسانی جذبہ بول رہا ہے۔ جہاں اس نفسانی جذبہ کی سیری ہوئی کہ تمہاری نگاہ بدل جائیگی۔

"مستقبل آپ کے اس قول کا جواب دے گا۔ کاش پریمیا! میں اپنا دل چیر کر تمہیں دکھا سکتا؟"

——— "یہ بھی تم نہیں کہہ رہے مہیپ کمار! تمہارے دل میں جو جوانی کا بھوت ہے۔ وہ کہہ رہا ہے۔ تم منتر کی طرح کام کر رہے ہو"

——— "وقت آئے گا تو میں تمہیں بتلاؤں گا کہ میں تمہارے لئے کیا نہیں کر سکتا"

——— میں نے سینکڑوں کتابوں کا مطالعہ کیا ہے۔ ان میں زیادہ تر نوجوانوں نے تمہاری طرح نازنینوں سے عشق کیا۔ اور کچھ دنوں تک عشق دکھلا کر آخر کار انہیں دودھ کی مکھی کی طرح چھوڑ دیا۔

——— "سب انگلیاں برابر نہیں ہوا کرتیں"

اس دن اسی طرح کی باتیں ہوئیں۔ مہیپ کمار نے اپنی محبت کا ایسے دلفریب الفاظ میں ذکر کیا کہ سنکر طبیعت بشاش ہوگئی۔ کافی رات گئے میں گھر واپس آئی۔ والدہ اس وقت تک میرے انتظار میں بیٹھی تھی۔ میں نے اپنے کمرے میں جاکر کپڑے بدلے۔ اور کھانا کھانے کے لئے باورچی خانہ میں گئی۔

والدہ کا چہرہ پھولا ہوا تھا۔ ادھ کافی دنوں سے والدہ سے اور مجھ سے بہت کم باتیں ہوا کرتی تھیں۔ مہیپ کمار سے واقفیت بڑھ جانے کے بعد تو ایسا جان پڑتا تھا۔ جیسے والدہ کو مجھ سے نفرت سی ہوگئی ہے۔ وہ جہاں تک ہوتا میرے سامنے ہی نہ آتی تھیں۔ میں بھی ان کے سامنے نہ آتی تھی۔ زیادہ تر میں کھانا کھاکر گھومنے کے لئے نکلتی تھی۔ اور واپس آکر چپ چاپ اپنے کمرے میں جاکر سو جاتی تھی۔ اس

دن کھانا کھا کر نہ جانے کے باعث مجھے باورچی خانہ میں جانا پڑا۔ والدہ نے کھانا پروس دیا میں کھانے لگی مشکل سے چار پانچ لقمے کھائے ہونگے کہ والدہ نے بات چیت کرنی شروع کر دی۔

"بہ بیا! آج کل تیرے آثار اچھے نہیں جان پڑتے۔ بھیپ راجا کا لڑکا ہے تو اس سے کیا؟ کیا راجوں کے لڑکے بدمعاش نہیں ہوتے۔ پھر ہمیں راجاؤں سے لینا کیا ہے؟ پرماتما نے ہمیں غریب بنایا ہے۔ ہم غریبی میں ہی سکھی ہیں۔ راحت صبر میں ملتی ہے۔

تیری شادی ہو چکی ہے تیرا اس طرح دوسرے کے ساتھ گھومنا اچھا نہیں ہے۔ آس پاس کے لوگ کانا پھوسی کرنے لگے ہیں۔ میں سنتے سنتے عاجز آ گئی ہوں تجھے اپنا یہ ڈھنگ چھوڑ دینا ہوگا۔ ہم غریب ہیں تو ہمیں سادہ کپڑے پہننا چاہیئے۔ ریشمی اور مخملی لباس زیب تن نہیں کرنا چاہیئے۔ ہم اگر غریب ہیں تو ہمیں روکھی سوکھی کھا کر ہی صبر کر لینا چاہیئے۔ بیوہ جات اور مٹھائیوں کے لئے جی نہیں للچانا چاہیئے سمجھی۔"

وہ اور نہ جانے کیا کیا بکتیں۔ اس لئے میں نے پانی پیا۔ اور تھالی پرسے اٹھ بیٹھی وہ بھی اٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔ اور زور زور سے کہنے لگیں۔ ان کا تو دماغ پھر گیا ہے ورنہ کیا کوئی شادی شدہ اور سیانی لڑکی کو اس طرح کی آزادی دیتا ہے۔ بہ بیا! تو تجھے اپنا طور بدلنا ہوگا ورنہ میں اس گھر کو چھوڑ کر کہیں چلی جاؤں گی۔"

میں نے کچھ جواب نہیں دیا۔ اور اپنے کمرے میں چلی آئی۔ والدہ کی باتیں اس وقت بہت تلخ معلوم ہوئی تھیں۔ مگر اگر اس کڑوی دوا کا اثر اس دن سے شروع ہو جاتا۔ تو آج اپنی اس گناہ آلودہ آپ بیتی کو لکھنے کی ضرورت ہی نہ پڑتی۔

جذبات کے قابو میں

ہم دونوں کے درمیان ایک ہی قسم کا اختلاف رہ گیا تھا۔ دیپ اور میں ایک دوسرے کے اتنے نزدیک پہنچ گئے تھے کہ آپ میں اور تو کا فرق نہیں رہا تھا۔ سوسائٹی اور شوہران دونوں کا خوف بھی ہم لوگوں کی راہ محبت میں رکاوٹ نہیں ڈال سکتا تھا۔ سوسائٹی کا منہ تو آسانی کے ساتھ بند کیا جا سکتا تھا۔ اور شوہر کا خوف مجھے اس لئے نہیں تھا کہ وہ بھی ایک لڑکی سے محبت کر چکے تھے۔ انہوں نے جب ایک لڑکی کے ساتھ شادی سے پیشتر ہی رشتہ محبت جوڑا تو پھر کیا کسی نوجوان کے ساتھ محبت کرنا میرے لئے گناہ ہو سکتا تھا۔ کیونکہ اگر مرد محبت کر سکتے ہیں تو عورتیں کیوں نہیں کر سکتیں۔

میرے شوہر نے اپنی جو داستان محبت سنائی تھی۔ اس میں انہوں نے یہ بتانے کی کوشش کی تھی کہ جس لڑکی کے ساتھ ان کا رشتہ محبت قائم ہوا تھا وہ بغیر چھوئے ہی بچ گئی۔ میرا خیال تھا کہ شوہر موصوف نے اپنی پاکیزگی کی حفاظت اور میری خواہشات کو چوٹ نہ پہنچانے کے ارادہ سے محبت کے متعلق تمام حالات بے کم و کاست میرے گوش گذار نہیں کئے تھے۔ ورنہ کیا یہ کبھی ممکن ہے کہ دونوں طرف برابر لگی ہوئی آگ دھواں ہی نکالتی رہی۔ اس طرح کے خیالات میرے دل میں رات دن چکر لگایا کرتے تھے۔

میرے اس طرح کے دلی جذبات کو مسٹر دیپ کمار نے اور بھی بھڑکایا۔ وہ مجھے کچھ ایسی کتابیں لا کر پڑھنے کے لئے دینے لگے جن میں مغربی ممالک کی لڑکیوں کی آزادانہ زندگی کی تصاویر درج ہوتی تھیں۔ مثلاً

٭ لیڈی چارٹی لینز فرسٹ لو" "مائی فرسٹ لو" "لو اینڈ فرسٹ سائیٹ

(لیڈی چارٹی لینز کا پہلا عاشق) (میری پہلی محبت) (محبت اور پہلی نگاہ)
ہیچو قسم کی دیگر کتب انہوں نے مجھے پڑھنے کے لئے دیں والدہ تو پڑھی لکھی تھی نہیں اور والد صاحب ہیپ کمار کے زیر اثر آنے لگے تھے کہ وہ کچھ کہتے نہیں تھے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میرے دل میں آزادی کا جذبہ دن بدن بڑھنے لگا۔

ایبٹ آباد میں موٹر میں بیٹھ کر جب میں کسی دوکان سے کوئی چیز خریدنے جاتی تو دوکان کے ملازم دوڑ کر موٹر کا دروازہ کھول دیتے۔ فرمائش کی چیزیں موٹر میں ہی دیکھنے کے لئے آجاتیں ان لوگوں کی نظر میں میں کتنی معزز خاتون جان پڑتی تھی۔ کبھی کبھی جب میں اپنے شوہر کی معمولی حیثیت پر غور کرتی تو مجھے بہت دکھ ہوتا کہ بے فائدہ ہی والدہ صاحبہ نے میری شادی ان کے ساتھ کردی اگر میری شادی نہ ہوئی ہوتی تو مسٹر ہیپ کمار ضرور ہی میرے ساتھ شادی کرلیتے۔ اس وقت مجھے کتنی راحت نصیب ہوتی۔

مس راجکماری جس کا اصلی نام لکھ کر میں اس کا دل رنجیدہ نہیں کرنا چاہتی۔ ہم لوگوں کی بڑھتی ہوئی محبت دیکھ کر اتنی ناراض ہوگئیں کہ اس نے ہیپ کمار سے ملنا جلنا تک بند کردیا۔ وہ ایک مرتبہ جب میں نے ان سے مس راجکماری کا ذکر کیا تو کہنے لگے۔

"اب سونا مجھے مل گیا ہے تو چاندی کی فکر کیوں کروں"
میں کہتی "یہ سونا تو دوسرے کا ہے"
——— "مگر وہ چاندی بھی تو دوسرے کی ہے"
——— "اسے آپ اپنی بنا سکتے ہیں"
——— "مگر سونے کو چھوڑ کر چاندی کو کون پسند کرے گا"

"یہ سونا کتنے دنوں تک تمہارے پاس رہ سکیگا؟"

ویسے نہ رہیگا تو دل میں تصویر بنا کر تو میں رکھ سکونگا۔ خانۂ دل میں مقیم بت کو تو کوئی اٹھا کر بھی نہیں لے جا سکیگا۔

یہ کہہ کر انہوں نے لمبی سانس کھینچی اور میرے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر میرے دونوں ہاتھ اپنے سینے میں لگا لئے۔ میں نے ان کے اس کام کی نہ جانے کیوں مخالفت نہ کی۔

ہم لوگ جب کبھی سیر کو جاتے تو دو ایک چھوٹے بچوں کو ساتھ لے جاتے۔ بچوں کے لئے راستے میں کچھ مٹھائی خرید لیتے۔ یا ان کو کوئی کھلونا لے دیتے۔ وہ اسی میں مست بنے رہتے۔ ادھر ہم لوگ اپنی بات چیت جاری کر دیتے۔ زندگی کے ہر ایک پہلو پر بات چیت ہوتی۔ ایک مرتبہ ہم لوگ سیر کے لئے جا رہے تھے۔ مہیپ کمار کے سر میں درد تھا۔ جب موٹر لکھنؤ کی سڑکوں کو عبور کر کے باہر نکل آئی۔ تو ایسا جان پڑا جیسے مہیپ کمار کے سر کا درد زیادہ زوروں پر ہے۔ وہ پریشان دکھائی دیتے تھے۔ ہم لوگ اکثر شہر سے کافی دور سیر کرنے کے لئے جایا کرتے تھے۔ موٹر سڑک کے کنارے کھڑی کر کے ہم لوگ کھیتوں کے آس پاس گھوم کر قدرتی نظاروں کا لطف اٹھاتے۔ بچے کبھی سرسوں کے پھول توڑتے تو کبھی چنے کا ساگ کھانے لگتے۔ اس دن میری سات برس کی چھوٹی بہن کے سوائے اور کوئی لڑکا ہم لوگوں کے ساتھ نہ آیا تھا مہیپ میرے پاس ہی بیٹھے تھے۔ وہ میری طرف کچھ جھک گئے۔ وہ اپنی پیشانی کو کافی زور سے اپنے دونوں ہاتھوں سے دبائے ہوئے تھے۔ کافی دیر تک اسطرح جھکنے کے بعد انہوں نے اپنا سر میری ران پر رکھ دیا۔

غیر مرد کے چھو جانے سے میرا تمام جسم تھر تھر کانپنے لگا۔ مگر مہیپ کمار کی بے چینی دیکھ کر میں نے ان کے سر رکھنے پر اعتراض نہ کیا بلکہ اپنے دائیں ہاتھ

سے ان کے سر کو سہلانے لگی۔

موٹر کافی تیز رفتار سے جا رہی تھی۔ میری بہن اس بندر میں چابی بھر رہی تھی۔ جو اسی دن مہیپ کمار نے اسے خرید دیا تھا۔ ان کا سر میری ایک ران پر تھا اور میرا دوسرا ہاتھ ان کے بالوں پر۔ کچھ دیر تک میں ان کا سر سہلاتی رہی۔ کچھ دیر بعد انہوں نے کہا ——— میں تمہارے لئے کیا کروں؟"

میں چونک پڑی۔ ان کا سوال کچھ بیہودہ تھا۔ میں نے سمجھ کر بھی نہ سمجھنے کا بہانہ کرتے ہوئے کہا "میرے لئے تو آپ بہت کچھ کر رہے ہیں۔ آپ نے تو میری زندگی پلٹ دی ہے۔

"میں اور کتنے دنوں تک اسی طرح فرقت کی آگ ....."

یہ کہتے کہتے انہوں نے دونوں ہاتھ میری گردن میں ڈال دیئے اور پوری طاقت سے مجھے اپنی آغوش میں لے لیا۔

"میں مُرلی دھر کی مُرلی بھئی۔ میری بھئے مرلی دھر مالا"

جب سینہ گلاب تھا

والدہ کی اس تعلیم کا اثر دو ایک دن رہا۔ اس کے بعد پھر وہی رفتار جاری ہو گئی۔ ہیمپ کمار کو نہ میرے بغیر چین پڑتا تھا۔ اور نہ میں انہیں دیکھے بغیر رہ سکتی تھی کالج میں بھی اکثر لڑکیاں یہ سمجھنے لگی تھیں کہ ہیمپ کمار سے میرے تعلقات گھر سے ہو گئے ہیں۔ بعض لڑکیاں مجھے حسد کی نگاہ سے دیکھتی تھیں کبھی کبھی میں ہیمپ کمار کی موٹر میں بیٹھ کر سینما دیکھنے جاتی اور وہاں پر کالج کی کسی لڑکی سے ملاقات ہو جاتی تو اس وقت میرا رعب دیکھنے کے قابل ہوتا تھا۔ میرے ساتھ والے کا ٹکٹ تو ہیمپ کمار خریدتے ہی تھے۔ مگر ساتھ ہی ساتھ وہ اس کی لیمونیڈ۔ سوڈا۔ چائے وغیرہ سے خاطر تواضع کرنا نہ بھولتے تھے کئی مرتبہ کالج کی لڑکیاں اس طرح میرے ساتھ سینما دیکھ چکی تھیں۔

ایک مرتبہ ایک تھیٹریکل کمپنی لکھنؤ آئی تھی۔ اس کے ناٹکوں کی بڑی دھوم مچی تھی کہ گھسیاروں تک اپنے عزیز و اقارب کے پیٹ کی فکر نہ کر گھاس فروخت کر بھوکے پیٹ رہ کر تھیٹر دیکھنے جایا کرتے تھے۔ کالج کی دو تین لڑکیوں نے مجھے تھیٹر دکھلانے کے لئے کہا۔ میں نے انہیں دعوت دے دی۔ اسی دن ساڑھے سات سات والے دس ٹکٹ مسٹر ہیمپ کمار خرید لائے۔ ہم لوگوں نے اطمینان سے ناٹک دیکھا۔

کالج کی لڑکیوں پر اس طرح ہیمپ کمار کی وجہ سے میرا رعب غالب آ گیا والد صاحب مالی حیثیت کم ہونے کے باعث میرے لئے اچھی اچھی ساڑھیاں خرید کر نہیں لا سکتے تھے۔ میرے شوہر کیا کرتے یہ اس وقت تک مجھے معلوم نہ تھا کہ ہیمپ

13510

کمار نے سو سو روپیہ کی آٹھ دس ساڑھیاں خرید کر مجھے لا دی تھیں۔ میرے لئے جس کسی چیز کی ضرورت ہوتی بغیر کہے ہی مہیپ کمار لے آتے تھے۔ تیل۔ صابن سینٹ سنو۔ وغیرہ کی نہ جانے کتنی شیشیاں وہ لاتے تھے۔ میں نے کالج کی کئی لڑکیوں کو سینٹ (خوشبو) کی شیشیاں نذر کیں۔ چندرا مجھ پر سخت نکتہ چینی کرنے لگی تھی اسے میرا اس طرح عیش میں غلطاں رہنا پسند نہیں تھا۔ ایک دن کالج میں مشاعرہ تھا۔ جس میں چندرا نے ایک نظم پڑھ کر سنائی نظم بہت اعلےٰ تھی۔ مگر مجھے ایسا جان پڑا کہ اس میں مجھے ہی نشانہ بنایا گیا ہے۔ چندرا کی یہ حرکت مجھے بہت بُری معلوم ہوئی۔ نظم سنا کر جب وہ آئی تو میں نے اُسے ڈانٹا۔

"تمہاری یہ حرکت ٹھیک نہیں"

"کون سی حرکت"

"یہی جو ابھی آپ نے کی ہے"

——— میں نے تو کوئی حرکت نہیں کی ہے" ایک نظم سنائی ہے۔

——— مگر وہ نظم میرے اوپر لکھی گئی ہے۔

——— میری رائے میں تو ہر ایک لڑکی یہی سوچ سکتی ہے۔

تم پھر اسے پڑھو تو سمجھ جاؤ گی کہ ہر ایک کلی کے لئے یہی بات ہے۔

میں نے وہ نظم پڑھی نظم کا مفہوم حسب ذیل تھا۔

(۱)

وہ ایک خوبصورت کلی تھی۔ ہر ایک شہد کا خواہاں بھونرہ شہد نوش کرنے کی غرض سے نہیں تو کم از کم اس کی خوبصورتی کو دیکھنے کے لئے ضرور اس کے پاس آتا تھا مگر وہ سب سے الگ رہنا پسند کرتی تھی۔

اسی باعث سب اس کے دیدار کو ترسا کرتے تھے۔

باغ کا مالی اپنی دھن میں الگ ہی مست رہتا تھا۔ وہ سوچتا یہ کلی کسی دن بڑی ہو جائیگی۔ تمام دنیا اس کی خوشبو سے مہک اٹھیگی۔ میری یہ ٹوٹی جھونپڑی سونے کا شاہی محل بن جائیگی۔ سب لوگ مجھے عزت کی نگاہ سے دیکھیں گے۔ آہا کتنا خوبصورت ہوگا۔ وہ دن۔

مالی کا دل کلی کی دیکھ بھال کرتے کرتے اُکتا گیا تھا۔ ایک دن صبح کی دیوی سونے کا تھال لیکر اپنے دل کے مالک کے استقبال کے لئے آئی۔ تو انہوں نے دیکھا مالی اس خوبصورت کلی کو چھوڑ کر کہیں جا رہا تھا۔

اس کے بعد کبھی بھی کسی نے اس مالی کو اس جھونپڑی میں نہیں دیکھا تھا لوگ کہتے ہیں کہ اس کلی کے علاوہ اس باغ کے مالی نے اس سے بھی خوبصورت ایک دوسری کلی بھی چھوڑ دی تھی۔

(۲)

آہا! ہا! کتنی خوبصورت ہے وہ۔ کتنی لاثانی خوبصورتی بھری ہوئی ہے۔ اس میں! کتنے خوبصورت ہونٹ ہیں۔ کتنی شیریں مسکراہٹ ہے۔ ایشور نے ..... خوبصورتی کا رس نچوڑ کر اس کلی کو بنایا ہے۔ کتنی خماری بھری ہے اس کی رسیلی چتون میں کتنا بھولا پن ٹپکتا ہے۔ اس کی باتوں میں۔ جو کوئی اس راستے سے نکلتا۔ اس کے منہ سے یہی کلمہ نکلتا دنیا اس کی مستی پر ..... فریفتہ ہو رہی تھی۔ کوئی اُسے گلے کا ہار بنانا چاہتا تھا۔ کوئی اسے دل کے مندر کی دیوی بنا کر پوجا کرنے کا خواہاں تھا۔ کوئی کوئی نیچ بھونرے اس کی خوبصورتی کا رس لوٹ لینا چاہتے تھے۔

(۳)

کئی سال گذر گئے۔ کلی اب جوبن پر تھی۔ مالی کے جانے کے بعد اس کی دیکھ بھال

کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ کئی لوگ آئے اور کلی کی حفاظت کے نام پر باغ کی تمام دولت لے کر نو دو گیارہ ہو گئے۔ مگر اس نازک اندام کلی کی حفاظت کا دھیان کسی کو نہ تھا۔

دیکھتے دیکھتے بیچ بھید خزاں نے اس کی دولت حسن پر چھاپہ مار دیا۔ اس کی تمام دولت لوٹ لی۔ وہ بھونرے جو اس کی تعریف کے پل باندھا کرتے تھے۔ موقع دیکھ کر اڑ گئے۔ وہ پجاری جو اس کی پوجا کرنے کے لئے تیار تھے نفرت کرنے لگے وہ جو کبھی حسرت بھری نگاہ سے تاکا کرتے تھے یہ کہہ کر آواز یں کسنے لگے:-

"وہ دن ہوا ہوئے جب کہ پسینہ گلاب تھا"

بہت دنوں کے بعد مالی واپس آیا کلی کی یاد نے اسے پاگل بنا دیا تھا۔ وہ اپنے بھرے باغ کو دیکھنے کے لئے دوڑا۔ مگر اس نے دیکھا۔ اس کی عزیز از جان وہ کلی مرجھا چکی تھی۔ اس کے بہار جوبن کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ اس میں خوشبو نام کو بھی نہ تھی۔ مالی کی تمام دنیاوی امیدوں کا خاتمہ ہو چکا تھا۔

اس میں اب ذرا بھی شک نہیں۔ رہ گیا تھا کہ وہ نظم میرے ہی اوپر لکھی گئی تھی۔ میں سوچنے لگی درحقیقت اس بدقسمت کلی کی طرح میری زندگی بھی نیست و نابود ہو جائے گی۔ مجھے دیکھ کر بھی وہ جو کبھی حسرت بھری نظر سے مجھے دیکھا کرتے تھے کہنے لگیں گے۔ سے

"وہ دن ہوا ہوئے جب کہ پسینہ گلاب تھا"

آہ کتنا منحوس ہوگا وہ دن۔

گناہ کی وادی میں

راحت اور چین کے ساتھ زندگی بسر ہو رہی تھی۔ اس وقت یہی جان پڑتا تھا کہ شاید یہ زندگی کی حقیقی راحت ہے۔ گومتی کے کنارے پر لہروں کے سُر میں سُر ملا کر جب میں کچھ گنگنانے لگتی تو مہیپ کمار جادو کے بس میں آئے ہوئے انسان کی طرح صُم بُکمٌ ہو کر میری طرف دیکھتے رہ جاتے۔ اگرچہ مجھے اپنے شوہر کی جانب سے اکثر محبت سے لبریز خطوط موصول ہوا کرتے تھے مگر میں ان کا جواب تک نہ دیتی تھی۔ کبھی کبھی دو چار سطروں میں کسی خط کا جواب دیدیتی۔ میں نے آج آپ کو خواب میں دیکھا۔ دل آپ کے لئے بہت بے چین ہے۔ وغیرہ وغیرہ جھوٹی باتیں لکھ کر میں اپنے شوہر کو خط لکھ دیا کرتی تھی۔

چندرا کو یہ بات پسند نہ تھی۔ کہ میں مہیپ کمار سے اتنا زیادہ میل ملاپ بڑھاؤں مگر میں مہیپ کمار کے مایا جال میں اس طرح پھنس چکی تھی۔ کہ اس سے باہر نکلنا میری طاقت سے باہر ہو رہا تھا۔ ایک دن کالج میں چندرا نے مجھے تنہائی میں ملا کر کہا ــــ "بہن پریما! مجھے تجھ سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔ چل ذرا ریڈنگ روم میں چلیں۔ میں اس کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے اس کے ساتھ ساتھ چلی گئی۔ ہم دونوں ایک کونے میں پڑی ہوئی دو کرسیوں پر جا کر بیٹھ گئیں چندرا نے کہا بہن! کافی دنوں سے میرا ارادہ تم سے باتیں کرنے کا تھا مگر اب تک خاموش رہی۔ لیکن اب خاموش رہنا میرے لئے مشکل ہے۔ آج میں تم سے صاف طور پر کہتی ہوں۔ کہ اس روز کی نظم میں نے تمہیں کو مدنظر رکھ کر لکھی تھی۔ جب میں لکھنے بیٹھی تب تم میری آنکھوں کے سامنے تھیں۔ اگر برا نہ مانو تو ایک بات پوچھوں؟"

"میں ہاں!! پوچھو۔ تیری بات کا میں کیا برا مانوں گی؟" میں نے کہا۔
"کیا تو اپنے شوہر سے ناراض ہے؟"
"نہیں تو"
"پھر مہیپ کے گلے کا ہار کیوں بنتی جا رہی ہے۔ کیا تمہارے شوہر تمہیں محبت نہیں کرتے؟"
"محبت کیوں نہیں کرتے جتنے دنوں تک میں ان کے پاس رہی انہوں نے مجھے اپنی آنکھوں کی پتلی بنا کر رکھا"
"تب اس کے ساتھ دھوکا کیوں؟"
"کیسا دھوکا؟"
دیکھو بنومت۔ مجھ سے کچھ پوشیدہ نہیں ہے۔ تمہاری اور مہیپ کمار کی محبت نے تعلیم کے نام کو داغ لگا دیا۔ آج ہندوستان میں مستورات کو بیدار کرنے کے لئے جدوجہد کر رہا ہے۔ لڑکیوں کو تعلیمیافتہ بنانے کے لئے چاروں طرف سے آواز بلند ہو رہی ہے۔ مستورات کو مساوی حقوق دینے کے لئے کوششیں ہو رہی ہیں مستورات کو آزادی چاہیئے نہ کہ ان میں باغیانہ خیالات کی اشاعت تمہارے گھر والوں نے تمہارے شوہر نے تمہیں گھومنے پھرنے کی آزادی دی ہے تو تم اس کا برا استعمال مت کرو تم نے ایک دن مجھ سے صلاح لی تھی۔ کہ کس طرح اس مہیپ کے پنجوں سے بچوں۔ مگر آج میں تم سے اصرار کر رہی ہوں تعلیمیافتہ عورت کی خاطر اس بدصحبت سے منہ موڑو۔ ورنہ تمہاری زندگی عورت کی زندگی نہ ہوگی بلکہ فاحشہ عورت کی زندگی بن جائے گی یہ مہیپ کبھی تمہارا ساتھ نہیں دے سکتا۔ جب تک تمہارے پاس حسن اور جوبن ہے۔ تب تک وہ تمہارا عاشق ہے اس کے بعد وہ نئی چیز کی تلاش کرے گا۔ اگر اس دوران میں کوئی واقعہ ایسا ہو گیا۔ تو پھر تمہارے لئے

دو ہی راستے رہ جائیں گے۔ ایک تو خودکشی کر لینا یا رقاصہ کی زندگی بسر کرنا۔

میں خاموش تھی۔ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ کہ چندرا کے سوالوں کا کیا جواب دوں۔ چندرا کی ان باتوں سے پہلے تو شاید ہی کبھی یہ بات میرے دماغ میں آئی ہو۔ کہ میں اپنے شوہر کے ساتھ بے انصافی کر رہی ہوں۔ ہمیپ کے ساتھ رہنے میں مجھے روحانی راحت نصیب ہوتی تھی۔ مگر چندرا نے ہم لوگوں کی اس عشقیہ زندگی کے متعلق جو پیشین گوئی کی اسے سُنکر میں صُم بکم رہ گئی۔

میں نے مضمون کو اور بھی زیادہ صاف کر دینے کے لئے کہا "میں تمہارا مطلب نہیں سمجھی"

"میرا مطلب تو بالکل صاف ہے۔ میں یہ جاننا چاہتی ہوں کہ کیا ہمیپ کمار سے عاشقانہ تعلق قائم کر کے تم یہ محسوس نہیں کر رہی ہو۔ کہ تمہارا روحانی تنزل ہو گیا ہے اور تم اس راستے سے جا رہی ہو جو تمہیں ایسے مقام پر پہنچائے گا۔ جہاں تمہیں دیکھ کر مہذب سوسائٹی منہ پھیر لے گی"

"یعنی"

"یعنی تم دھوبی کے کتے کی طرح نہ گھر کی رہو گی نہ گھاٹ کی۔ میں منہ پھٹ ہوں۔ صاف بات کہنے میں مجھے ڈر نہیں لگتا۔ میں نے اس دن نظم میں بتلایا تھا۔ کہ کلی جب مرجھا گئی تو پھول کی مستی پر فریفتہ رہنے والے بھونرے اُڑ گئے تم اس کلی کی طرح ہی اپنے آپ کو سمجھو۔ میں زیادہ صاف طور سے اور کیا کہوں تمہیں اپنی غلطی کے لئے زندگی بھر کفِ افسوس ملنا پڑے گا۔ اب بھی سنبھل جاؤ۔ اور جتنی آگے بڑھ چکی ہو۔ اتنی ہی پیچھے ہٹ جاؤ"

چندرا یہ کہتے کہتے جوش میں آ گئی۔ غصہ سے اُس کی آنکھیں سُرخ ہو گئیں چندرا سچ کہہ رہی تھی۔ مجھے اپنے شوہر کے ساتھ دھوکا نہیں کرنا

چاہیئے تھا۔ شوہر نے جس محبت کے ساتھ مجھے رخصت کیا تھا۔ ان کے خطوط سے جس طرح کی محبت ٹپکتی تھی۔ اسے دیکھ کر مجھے اپنے آپ پر اس دن پہلی مرتبہ نفرت ہوئی۔ مجھے اس دن نفرت ہوئی۔ اور اپنے آپ پر بہت غصہ بھی آیا۔ مگر چندرا کی وہ ٹیک صلاح بہت دیر کے بعد ملی۔ میں نے دونوں ہاتھ پیشانی پر ٹیکتے ہوئے کہا "چندرا! تم نے اس سے پہلے یہ نظم کیوں نہ بنائی؟"

دامن کا داغ

"اب کیا ہوگا؟"

گھبراتی کیوں ہو۔ سب ٹھیک ہو جائیگا۔ میں نے ڈاکٹر ٹنڈن سے بات کی تھی۔ انہوں نے انجکشن دینے کی صلاح دی ہے۔

"تم نے ان سے سب کچھ کہہ دیا ہوگا؟"

نہیں! نہیں میں ایسا بیوقوف نہیں ہوں کہ سب باتیں ہر کسی کے سامنے کہدوں؟ میں نے ان سے یہی کہا تھا میری ایک واقف کار ہے۔

"مسٹر مہیپ کمار آپ نے مجھے چوپٹ کر دیا"

اس میں میرا کیا قصور ہے؟"

"اچھا! تمہارا قصور نہیں تو پھر کس کا قصور ہے؟ تمہیں تو مجھے روزانہ بائیسکوپ میں عشقیہ فلم دکھایا کرتے تھے۔ تمہیں نے تو مجھے معشوق بننے کا کھیل سکھلایا۔ تمہیں نے تو ایک شادی شدہ عورت کی زندگی تباہ کر دی اب میں کہیں کی نہ رہی۔ نہ تم اپنا سکتے ہو۔ اور نہ ایک حاملہ بدمعاش عورت کو اسکا شوہر اپنا سکتے ہو۔ بولو۔ بولو۔ پتھر کی طرح خاموش کیوں ہو؟ اب میں کیا کروں"

"پریما گھبراتی کیوں ہو؟ تمہارا حمل گرایا جا سکیگا۔ ابھی تین ہی مہینے کی بات ہے۔ کسی کو ابھی شک نہیں ہوا۔

"تیس چالیس روز سے تو تم کوشش کر رہے ہو۔ مگر نتیجہ کچھ نہیں نکلا۔ اب میرے گونے کے تین مہینے باقی ہیں۔ میں کیا منہ لے کر شوہر کے سامنے جاؤں گی؟ کیسے اسے اپنا منہ دکھلاؤں گی؟ آہ! انہوں نے کتنی الفت کے

ساتھ مجھے رخصت کیا تھا۔ امتحان میں کامیاب ہونے کے خیال سے انہوں نے ڈیڑھ سال سے گونے کا نام نہیں لیا۔ مگر وہ کیا جانتے ہوں گے۔ کہ ان کی پرمیا! چنڈال بن گئی ہے۔ اس نے وہ کام کیا ہے جس کی کوئی تلافی نہیں۔ بولو مہیپ کیا تم میرے لئے تھوڑی سی افیون نہیں لا سکتے۔ میں افیون کھا کر خودکشی کر لوں گی۔ میں دنیا کو اب منہ دکھلانے کے قابل نہیں رہی میں نے غصہ بھرے الفاظ میں کہا۔

مہیپ کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ تھوڑی دیر کے لئے خاموشی اختیار کر پھر وہ بولا "پرمیا! تمہیں جس بات کا ڈر ہے اُسے میں دور کرنیکا ذمہ لیتا ہوں۔ میں تمہارا حمل گرادوں گا۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوگی"

"ہاں حمل گروا دوں گا۔ مگر تمہارے ساتھ شادی نہیں کر سکتا۔ میرے ساتھ اٹھکھیلیاں کر سکتے ہو۔ ایک شادی شدہ عورت کی عصمت بگاڑ کر اسے تباہ کر سکتے ہو۔ مگر اس کے ساتھ ظاہرا طور پر شادی نہیں کر سکتے۔ اس سے تمہاری عزت میں بٹہ لگ جائیگا۔ تمہاری رعایا میں بغاوت پھیل جائیگی کیوں؟ مردوں کی کمزوریوں کا مذاق اڑانے والے معزز شخص کیا تم کچھ جرأت نہیں دکھلا سکتے"

تم آپے سے باہر ہو رہی ہو پرمیا! میں قسم کھا کر کہہ رہا ہوں کہ تمہارے لئے جو کچھ کر سکتا ہوں۔ اس میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھوں گا"

"میرے لئے اب رہ ہی کیا گیا ہے۔ دنیا کے لوگ جب سنیں گے کہ فلاں شخص کی شادی شدہ لڑکی نے ایک دوسرے نوجوان سے رشتہ محبت قائم کیا اور اس کے حمل ہو گیا۔ تو والد صاحب کو زندہ رہنا دوبھر ہو جائیگا۔ میری والدہ پتھر پر سر پٹک کر جان دیدیگی۔ اور میرے شوہر کا کیا حال ہوگا؟ کہہ نہیں

سکتی ؟"

یہ کہہ کر میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ رات کے ۸ بجے تھے۔ سیر کے لئے نکلے ہوئے ہم دونوں میں مندرجہ بالا گفتگو ہوئی۔ ہیپ کمار نے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا:

"دیکھو جو ہونا تھا وہ تو ہو گیا۔ اب صرف افسوس کرنے سے کچھ نہ ہوگا۔ ہمیں کوشش کرنی چاہیئے جس سے ہم لوگ اس بدنامی سے بچ جائیں۔ انسان سے زندگی میں غلطی ہو سکتی ہے۔ اس غلطی کو دوبارہ نہ کرنے کا عہد کر غلطی کے لئے افسوس کرنا چاہیئے۔ کیا تمہیں یہ امید نہیں ہے کہ اگر تم اپنے شوہر کو تمام حال لکھ کر بھیجو دو گی تو وہ تمہیں معاف کر دیں گے؟"

"یہ کیا ممکن ہو سکتا ہے مسٹر ہیپ! کوئی بھی شوہر اپنی بدچلن عورت کو معاف نہیں کر سکتا۔ کیا تم تھوڑی سی جرأت سے کام نہیں لے سکتے۔ تم اگر چاہو تو مجھے اس آفت سے بچا سکتے ہو؟

"آؤ! ہم تم کلکتہ بھاگ چلیں۔ وہاں پر ہمیں کوئی نہیں جانتا۔ تم نے وہاں پر کوئی کاروبار کر لینا اور میں کسی فلم کمپنی میں نوکری کر لوں گی۔"

"مگر میری جدی جائداد؟"

تمہیں تو کہتے تھے کہ محبت کے پیچھے انسان بڑی سی بڑی قربانی کر سکتا ہے۔ لوگ بادشاہت چھوڑ دیتے ہیں۔ میں والد۔ والدہ۔ رشتہ دار۔ بھائی شوہر اور اپنے گھر تک کو چھوڑنے کے لئے تیار ہوں اور آپ اپنی جدی جائداد کو نہیں چھوڑ سکتے۔

میں چھوڑنے کے لئے تیار ہوں۔ مگر میری اس قربانی سے پریما! تمہیں کچھ فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ اگر قربانی کرنے سے کسی کو کچھ فائدہ حاصل نہ ہو۔ تو پھر اس قربانی کرنے سے کیا فائدہ ایسی قربانی کو لوگ قربانی نہیں کہتے۔ بلکہ سخت غلطی کہتے ہیں تم کلکتہ چلی جاؤ۔ میں تمہارے قیام وغیرہ کے لئے۔ وہاں سب طرح کا انتظام کر

دوں گا۔ تم نے وہاں رہنا۔ میں کبھی کبھی تمہارے پاس آیا کروں گا۔ اگر حمل گرانے میں کچھ کامیابی نہ ہوئی۔ تو بچہ پیدا ہو جانے کے بعد میں تمہیں کسی فلم کمپنی میں ملازم کرا دوں گا۔"

"میرے یہاں سے چلے جانے کے بعد میرے خاندان کی کیا حالت ہوگی؟ کیا زندگی میں میں پھر کبھی انہیں اپنا منہ دکھلا سکوں گی؟"

"خاندان کی فکر چھوڑو؟ پریما! بُری حالت کا مقابلہ کرو۔"

ہاں میں خاندان کی فکر چھوڑ دوں۔ اور بُری حالت کا مقابلہ کروں۔ اور تم پر یوار میں رہ کر مسرت کی زندگی بسر کرو۔ اور جدّی جائداد سے عیش اڑاؤ۔ واہ رے مردوں کی خود غرض ذات!

رات کافی گذر چکی تھی۔ اس لئے ہم لوگوں نے گھر کا رُخ کیا۔ مہیپ کمار کی گاڑی مجھے گھر پر پہنچا کر چلی گئی۔ میں سیدھی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اور چارپائی پر جا کر لیٹ گئی۔ شاید میرے پاؤں کی آواز سے والدہ کو میری آمد کا پتہ چل گیا تھا۔ وہ میرے پاس آ کر کہنے لگیں۔ ادھر کافی دنوں سے تجھے بہت پریشان دیکھ رہی ہوں۔ کیا بات ہے؟ میں نے دیکھا والدہ کے ان الفاظ میں ہمدردی کی گنگا بہہ رہی تھی۔

کچھ بھی تو نہیں۔ ادھر زکام بگڑ جانے کی وجہ سے سر ذرا بھاری رہتا ہے۔ اور کوئی بات نہیں" میں نے کہا۔

وہ بھی پوچھ رہے تھے۔ کہ پریما۔ آج کل بہت اُداس رہتی ہے۔ کیا گونے کے دن قریب آ جانے کی وجہ سے تو نہیں"

گونے کا نام سنتے ہی سخت درد ہونے لگا گویا سانپ نے ڈس لیا ہو۔ آہ! مجھ بدچلن میں وہ جرأت ہی کہاں تھی جو شوہر کے سامنے جا سکتی۔ جو شوہر میری پڑھائی میں رکاوٹ پڑ جانے کے باعث اتنے دنوں تک گونا کرانے کے لئے بھی تیار نہیں

ہوا تھا۔ اسے کیا پتہ تھا کہ اس کی پریما! اب اس کی نہیں رہی۔ ناچ اور گانے کے شوق نے اجوانی کے نئے جوش نے اسے ایسے گڑھے میں لے جاکر پٹک دیا ہے۔ جہاں سے اب اس کا نکل آنا ناممکن ہے۔

مجھے والدہ کا وہاں کھڑا رہنا بھی بُرا معلوم ہو رہا تھا۔ میں سوچتی تھی کہ وہ جتنی جلدی ہو سکے میری آنکھوں سے اوجھل ہو جائے۔ میں نے کہا "ماں! میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔ تم کھانا کھالو۔ میں کھانا نہ کھاؤنگی"

"لاؤ بیٹی تمہارا سر دبادوں۔ درد دور ہو جائیگا"

میں کچھ کہوں اس سے پیشتر ہی اس کا ہاتھ میرے سر پر پہنچ چکا تھا۔ کتنا سرد تھا وہ ہاتھ والدہ کے نازک ہاتھ کب تک میرے سر پر پیار کی بارش کرتے رہے۔ میں نہیں جانتی آنکھیں کھلنے پر میں نے دیکھا۔ صبح نمودار ہو گئی ہے۔ اور میری سہیلی چندرا پاس کھڑی ہوئی کچھ کہہ رہی تھی۔

"ارے سکھی! اب گڑیوں کے کھیل کھیلنا چھوڑ دے۔
کیونکہ اب تیرے گونے کے دن نزدیک آرہے ہیں۔
اب تجھے اپنے شوہر کے ساتھ کھیل کھیلنے پڑیں گے۔
اور یہ گڑیوں کے کھیل ہمیشہ کے لئے تجھ سے چھوٹ جائیں گے۔

پریتم کی یاد

تین چار دن مجھے نہ تو رات کو نیند آئی اور نہ دن میں کسی کام میں دل ہی لگا۔ یہی خواہش ہوتی کہ چپ چاپ پڑی رہوں۔ نہ کوئی میرے پاس آئے اور نہ میں کسی کے پاس جاؤں۔ مردوں سے زندگی میں بیشمار غلطیاں ہوتی ہیں مگر مستورات کی ایک غلطی ان کی زندگی تباہ کر دیتی ہے۔ میرے شوہر نے اگر کسی حسینہ سے محبت کی ہوتی اگر وہ نفسانی جذبات کے زیر اثر ہو کر راہ سے بھٹک گئے ہوتے تو سوسائٹی کو خبر تک نہ لگتی۔ مگر میری غلطی ایسی تھی جس کا پوشیدہ رہنا ناممکن تھا۔

اب میرے لئے ایک ہی راستہ رہ گیا تھا اور یہ تھا گھر کو ترک کر دینا اور کلکتہ یا بمبئی جیسے کسی بڑے شہر میں جا کر بود و باش اختیار کرنا۔ یہ ایسا کام تھا۔ جس کے محض تصور سے میرا دل کانپ اٹھتا تھا۔ والدہ کی محبت بھری گود۔ والدہ کا پیار۔ بھائی۔ بہنوں کی الفت یاد کر میں رو اٹھتی۔ اس لمحہ بھر کی راحت کے لئے مجھ سے کتنی عظیم غلطی سرزد ہو گئی آہ! اگر کالج کا وہ ڈرامہ نہ ہوا ہوتا تو میری گراوٹ اس طرح نہ ہوتی۔ اس ناٹک کے ساتھ ساتھ مجھے اپنے والد پر بھی غصہ آیا۔ کہ انہوں نے ایک دولتمند نوجوان کے چنگل میں پھنسنے سے اپنی بیٹی کو کیوں نہیں بچایا۔ وہ تجربہ کار تھے۔ انہوں نے دنیا دیکھی تھی۔ وہ جانتے تھے۔ کہ کس طرح دولتمند نوجوان اپنی دولت اور شان و شوکت کے زور سے لڑکیوں کی عصمت تباہ کر دیتے ہیں۔ مگر والد صاحب نے یہ سب جانکر بھی مجھے خبردار کیوں نہیں کیا۔

کبھی سوچتی والد صاحب کا اس میں کیا قصور ہے؟ وہ کیا یہ سوچتے ہونگے کہ انکی تعلیم یافتہ لڑکی شادی ہونے کے بعد بھی اس طرح کسی نوجوان کے ہاتھ کٹھ پتلی

ہو جائیگی۔ کبھی میں اپنے شوہر کے بارے میں سوچتی۔ ان کا یہ قول کانوں میں گونجنے لگتا "تم بھی کہیں میرے ساتھ دغا نہ کرنا پریما!" میں اپنے آپ پر بھی اتنی جھنجھلا اٹھتی۔ کہ کبھی کبھی دیوار سے اپنا سر دے مارتی۔ حمل گرانے کی کوشش میں پندرہ دن اور گذر گئے۔ مگر کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ آخر کار مہیپ کمار سے میری بات چیت ہوئی اور یہی فیصلہ کیا گیا۔ کہ میں کلکتہ چلی جاؤں اپنے شوہر کے ساتھ میں نے سخت بے انصافی کی تھی۔ ان کی محبت در اصل سچی تھی۔ یہ سوچکر میرا دل جل رہا تھا۔ گھر چھوڑنے سے پہلے میں ایک مرتبہ ان سے ملنا چاہتی تھی۔ کبھی سوچتی کسی سے کچھ کہے سنے بغیر سیدھی ان کے پاس چلی جاؤں۔ مگر ساس کی یاد کر حوصلہ ٹوٹ جاتا۔ آخر کار میں نے اپنے شوہر کو خط لکھنے کا ارادہ کیا۔ جو ذیل میں درج ہے۔

پیارے!

آپ پر میرا اب کوئی حق نہیں۔ ایک دن آپ نے بڑی محبت سے اس خادمہ کو اپنے فراخدل کے ایک گوشہ میں پناہ دی تھی۔ مگر بدقسمتی سے میں اس پناہ کے قابل ثابت نہ ہو سکی۔ میں نے ناقابل تلافی گناہ کیا ہے۔ آپ کی فراخدلی پر مجھے پورا بھروسہ ہے۔ مگر میرا قصور ایسا ہے جسے آپ اگر معاف بھی کر دیں۔ مگر سوسائٹی اسے کبھی برداشت نہیں کر سکتی۔ آپکی خواہش تھی۔ کہ میں بی۔ اے پاس کر لوں۔ اور اسوجہ سے آپ نے مجھے اپنی تعلیم جاری رکھنے کی صلاح دی تھی۔ مگر کالج کی تعلیم اور علم راگ میرے لئے قاتل ثابت ہوئے۔ ایک نوجوان ہم دونوں کی محبت کی راہ میں سدراہ بنا۔ اس کے پاس دولت تھی۔ اس کے جاہ و جلال نے میرے ہی نہیں بلکہ والد صاحب کی آنکھوں میں بھی چکا چوند پیدا کر دی وہ ہمارے ہاں آنے جانے لگا۔ ہمارے گھر میں وہ ایک شریف زادہ کی طرح آنے جانے لگا۔ گھر کی لڑکیاں اس سے اس طرح ملنے جلنے لگیں جس طرح اپنے بھائی سے ملتی ہیں۔ مگر وہ نوجوان کالا سانپ نکلا۔ اس نے میرے اوپر اپنا مایا جال

پھینکا۔ دنیا کا تجربہ نہ ہونے کے باعث میں اس نوجوان کے مایا جال میں پھنس گئی۔ مجھے لکھتے ہوئے شرم آرہی ہے کہ میرا اس نوجوان کے ساتھ ناجائز تعلق ہو گیا جس کا نتیجہ میرے پیٹ میں چار مہینہ کا حمل ہے۔ اس خبر سے آپ کو عظیم روحانی تکلیف ہوگی۔ یہ میں جانتی ہوں۔ کیونکہ آپکے نازک دل سے میں بخوبی واقف ہوں۔ میرے دل کی دولت! تم میرے زندگی کے آسمان پر کچھ دنوں تک مہتاب بن کر چمکے۔ مگر اس نوجوان نے راہو بن کر میری قسمت کے مہتاب کو جکڑ لیا۔ اب میں وہ نیچ ہوں جس کے لئے روئے زمین پر رہنے کے لئے کہیں کوئی جگہ نہیں۔ آپ کی فراخدلی اور عالی حوصلگی سے میں کامل طور پر واقف ہوں۔ مگر سوسائٹی کے آگے آپکی ایک نہ چلیگی۔ ساتھ ہی مجھے یہ یقین بھی نہیں ہوتا۔ کہ کوئی مرد اپنی بدچلن بیوی کو معاف کر کے اپنی عالی حوصلگی کا ثبوت دے سکتا ہے۔ ایک مرتبہ آپ نے کہا تھا "پریا! اگر تم کسی سے ناجائز محبت کرنے کی بھی غلطی کر بیٹھو گی تو بھی میں تمہیں معاف کر دوں گا۔ بس آپ کے ان الفاظ کے باعث ہی یہ خط لکھنے کی میں نے جرأت کی ہے۔ آپ نے اپنی داستان محبت میرے گوش گذار کی تھی۔ جس سے معلوم ہوا تھا۔ آپ کی تمام زندگی تفکرات میں ہی گذری۔ غریبی نے کبھی آپ کا دامن نہیں چھوڑا۔ مگر آپ نے مجھ سے شادی کی۔ یہ خدا کا آپ پر دوسرا قہر تھا۔ میرے دیوتا! میں نے تمہیں دھوکا دیا! تم دیوتا ہو۔ اور ہمیشہ میری آنکھوں میں دیوتا بنے رہو گے۔ اس بدقسمت نے جو گناہ کیا ہے اس کا اسے کفارہ کرنا ہی پڑے گا۔ وہ اپنے کئے کا کفارہ کرنے کا فیصلہ کر چکی ہے۔ خودکشی کر ڈالنے کی بھی میری کئی دفعہ خواہش ہوئی۔ مگر زندگی کے پیار نے ایسا نہیں کرنے دیا۔ میں مرنا نہیں چاہتی۔ مگر یہ چاہتی ہوں کہ ایسی دنیا میں پہنچ جاؤں۔ جہاں کوئی اپنا نہ ہو۔ اس کے لئے میں اپنے دستور العمل کا فیصلہ کر چکی ہوں۔ یہ خط جسوقت آپ کے ہاتھوں میں پہنچے گا۔ اس وقت یہ بدقسمت عورت

نہ جانے ہندوستان کے کس گوشے میں اپنے چہرے پر لگے ہوئے داغ کو مٹانے کی کوشش کر رہی ہوگی۔ آپ نے میری تلاش نہ کرنا۔ اور نہ اس راہ سے بھٹکی ہوئی لڑکی کو کبھی یاد کر کے اپنے بے داغ دل کو رنجیدہ کرنا۔ گناہ گار کو اپنے گناہوں کی سزا بھوگنی ہی پڑتی ہے۔ مجھے اپنے کئے ہوئے گناہ کی سزا بھوگنی ہی پڑے گی۔ مجھے رنج اسی بات کا ہے کہ بے وجہ میرے لئے آپ کو تکلیف اٹھانی پڑے گی۔ میں آپ کو خط لکھنا نہیں چاہتی تھی۔ مگر دل نے نہ مانا۔ اس بھونرے کی یاد آ گئی۔ جب کھلے ہوئے پھول کی مانند تم میرے نزدیک آئے تھے۔ پریتم! اگر تمہاری گود میں سر رکھ کر مر جانے کا موقع بھی مل جاتا تو میں چین کے ساتھ شاید مر بھی جاتی۔ مگر میری یہ خوش قسمتی کہاں؟ ایک مرتبہ یہ بھی دل میں آیا کہ آپ سے دریافت کروں کہ کیا اس قصور کی تلافی بھی ممکن ہے۔ مگر کچھ نہ کر سکی۔ آپ سے کہنے کے لئے دل میں بہت سی باتیں تھیں۔ مگر کہہ نہ سکی۔ یہ تمنا لئے جا رہی ہوں۔ کہ آپ سا فراخدل اور نیک شوہر پا کر بھی میں اپنی زندگی خوش اسلوبی سے بسر نہ کر سکی۔ آہ! وہ لڑکیاں کتنی خوش قسمت ہیں۔ جنہوں نے سکول اور کالج کے جھنجھٹوں سے دور رہ کر زندگی کی سچی راحت حاصل کی ہے ہے۔ دولت کی کمی کے باوجود جو اپنے شوہر کی پاکیزہ محبت کی گنگا میں غوطے لگا کر اپنی زندگی کو کامیاب بنا رہی ہیں میرے دل کی دولت! آپکی خادمہ سے خطا سرزد ہو گئی ہے۔ اس خطا کے لئے وہ آپ سے رحم کی خیرات مانگتی ہے۔ اگر سچے دل سے آپنے اس بدقسمت کو معاف کر دیا۔ تو یہ اس کے لئے کافی ہوگا۔ میں کہاں جا رہی ہوں۔ یہ میں خود نہیں جانتی۔ میری زندگی کی لہر مجھے جہاں بہا لے جائیگی میں وہیں چلی جاؤں گی۔ میرے قابل پرستش دیوتا! میری یہ گنہگار آنکھیں آپ سے معافی کی خیرات مانگ رہی ہیں۔ شاید زندگی میں آپ کبھی آپ سے ملاقات نہ ہو۔ اس لئے ایک مرتبہ پھر آپ کی نظر عنایت کی متلاشی

پریما! ایشور سے دعا مانگتی ہے کہ وہ آپکو ہمیشہ خوش و خرم رکھے۔ جو کچھ ہوا میری تقدیر سے ہوا۔ تم نے اس کے لئے رنجیدہ نہ ہونا۔ بیشمار عورتیں اسطرح راہ سے بھٹک جاتی ہیں۔ آپ میرے بداعمالوں کے لئے دکھی نہ ہوں۔ آپ یہ نہ سوچیں کہ آپ کی بیوی نے اتنا بڑا بھاری گناہ کر ڈالا۔ آپ کبھی اس بات کو اپنے دل میں جگہ نہ دیں کہ پریما نام کی کسی لڑکی سے آپ کی شادی ہوئی تھی میرے دیوتا! اس گنہگار کو معاف کرنا۔"

خط لکھ کر میں نے ایک لفافہ میں بند کر دیا اور اسے اپنی قمیض کی جیب میں رکھ لیا۔ میں سوچ رہی تھی کہ جس دن میں گھر چھوڑ کر کلکتہ کے لئے روانہ ہونگی۔ اس دن اس خط کو بیرنگ ڈاک میں ڈال دوں گی۔ خط لکھ کر میں چارپائی پر لیٹ گئی بیہاگ کی راحت پذیر پہلی رات آنکھوں کے سامنے آکر ناچنے لگی۔

دائمی مفارقت

محبت انسان کو اندھا بنا دیتی ہے۔ محبت کی پہلی چوٹ اتنی خطرناک ہوتی ہے کہ چوٹ کھانے والا زندگی بھر چین نہیں پاتا۔ میں نے بھی محبت کی چوٹ کھائی۔ اور اس چوٹ کے باعث گھر بار چھوڑا۔ بھائی بہن چھوٹے جان سے بھی زیادہ محبت کرنے والے شوہر کو بھی ترک کرنا پڑا

رات کی سنسناہٹ میں میں نے اپنی دو چار ضروری چیزوں کا بنڈل باندھا اور اپنے کمرے کے باہر آئی۔ میری بہنیں والدہ کے کمرہ میں لیٹی ہوئی تھیں۔ اس تاریکی میں اپنی سوئی بہنوں سے خاموش الفاظ میں رخصت لی۔ والدہ کو پرنام کیا اور والد کے کمرے کی دہلیز پر پیشانی رکھ کر ان کے پاک قدموں کو پرنام کیا۔ اس کے بعد اوپر آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر میں نے کہا:

اے میرے دیوتا! تم جہاں کہیں بھی ہو میرا پرنام منظور کرنا"

ایک مرتبہ دروازے تک جا کر میں پھر واپس لوٹ آئی۔ کمرے میں جا کر میں نے تمام چیزوں کو پھر جی بھر کر دیکھا۔ میری آنکھوں سے آنسوؤں کی دھار بہ رہی تھی۔ شوہر کے گھر جانے کے وقت بھی مجھے بڑا دکھ ہوا تھا۔ مگر اس وقت دوبارہ لوٹ آنے کی اُمید نے دکھ درد کو دور کر دیا تھا۔ انسان اُمید کے سہارے زندہ رہتا ہے۔ مگر اس سفر میں واپس آنے کی کوئی اُمید نہ تھی۔ یہ میری دائمی مفارقت تھی۔ میں دیواروں سے مل مل کر روئی۔ سسرال جاتے وقت سب سے کھل کر ملنے کا موقع تھا۔ مگر اس مرتبہ میں کسی سے مل بھی نہیں سکتی تھی۔ سب سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو رہی تھی۔ مگر جی بھر کر کسی کو دیکھ بھی

نہیں سکتی تھی۔ کیونکہ خوف تھا کہ کسی کو معلوم پڑ گیا تو بھاگنا بھی مشکل ہو جائے گا۔

چاروں طرف سناٹا تھا۔ والد صاحب کو میں نے تمام حالات سے آگاہ کرنے کے لئے خط لکھ دیا تھا۔ مگر والدہ کے سامنے کوئی بات ظاہر کرنے کا مجھ کو حوصلہ نہ پڑا۔ تقریباً دو بجے رات کو میں گھر سے نکل کر سڑک پر آ گئی۔ مہیپ کمار کا ایک ملازم پہلے ہی موجود تھا۔ تھوڑی دور تک میں ایک ٹانگہ میں آئی۔ اس کے بعد مہیپ کمار کی وہ جانی پہچانی موٹر مجھے لے کر الہ آباد کی جانب چل پڑی۔ مہیپ کمار تھوڑی دور تک پہنچا کر واپس لوٹ گئے۔ کیونکہ اس بات کا خوف تھا۔ کہ کہیں لوگوں کو شک نہ ہو جائے کہ میں مہیپ کمار کے ساتھ بھاگ چلی ہوں۔ اس باعث واپس چلے گئے۔ میرے کلکتہ میں رہنے کا تمام انتظام وہ پہلے ہی کر آئے تھے۔ ان کا ایک معتبر ملازم میرے ساتھ جا رہا تھا۔ اور میں اس کی بیٹی بن کر جا رہی تھی۔

یہ طے ہو چکا تھا۔ کہ کلکتہ میں میرے پیٹ کے پھوڑے کا علاج ہوگا یہی سب سے کہا جائے گا۔ موٹر چالیس میل کی رفتار سے جا رہی تھی۔ اور میرے دل کی رفتار کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ لڑکپن کا ایک ایک واقعہ میرے آنکھوں کے سامنے آ کر ناچنے لگا۔ میں ننھی بچی ہوں اپنے گھر کے صحن میں تتلی کی طرح پھدکتی پھر رہی ہوں۔ والدہ اور والد کا محبت میرے لئے اُمڈ پڑتا ہے۔ اسکے بعد میں سکول جاتی ہوں۔ اور لڑکیوں کی دیکھا دیکھی میرے سر پر فیشن کا بھوت سوار ہوتا ہے ایک دن میں اپنی والدہ سے آ کر کہتی ہوں "ماں! کل سے میں سکول نہ جاؤں گی؟" ماں نے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "کیوں؟" "سب لڑکیاں روزانہ نئی نئی ساڑھیاں پہنکر آتی ہیں۔ میں ہر روز

ایک ساڑھی پہن کر سکول نہیں جا سکتی مجھے بھی کئی ساڑھیاں چاہئیں۔"
ماں نے کہا تھا "تیرے باپ کے پاس اتنے پیسے کہاں ہیں بیٹی!"
میں نے ضد کی۔ والد صاحب نے دوسرے دن چھ اعلےٰ قسم کی ساڑھیاں میرے لئے لا دیں۔

والد صاحب کی لاثانی محبت حاصل ہوئی تھی مجھے!

صبح ہوتے ہی تمام شہر میں میرے بھاگ جانے کی خبر پھیل جائے گی۔ جو سنیگا وہی میرے نام پر تھوکے گا۔ بدقسمت پریما کا یہ بدنامی کا داغ دیگر تعلیمیافتہ لڑکیوں کے راستے میں سدراہ ہوگا۔

اسی طرح کے خیالات میں محو سو گئی۔ جب آنکھ کھلی تب میں نے دیکھا کہ موٹر ہم لوگوں کو لے کر پریاگ پہنچ چکی ہے۔ اس دن ترپینی میں جا کر بوڑھے دیارام نے غسل کیا۔ اس کے بہت اصرار کرنے پر بھی میں گنگا اشنان کرنے کے لئے نہیں گئی۔ ہوٹل کے کمرے میں ہی پڑی رہی۔ گاڑی شام کو تقریباً سات بجے کلکتہ جاتی تھی۔ اس باعث دن بھر پریاگ میں رہنا لازم تھا۔ وہ دن میرا رونے میں ہی گذر گیا دیارام کئی اخبار خرید کر میرے پاس رکھ گیا تھا۔ مگر میں نے ایک کو بھی اٹھا کر نہیں دیکھا۔ دن بھر اپنے گھر والوں کی یاد کر کر کے روتی رہی۔ کبھی والدہ کی محبت یاد کر کے روتی۔ اور کبھی والد کا پیار یاد کر آنسو بہاتی۔ کبھی اپنے چھوٹے بھائی ہریش کو یاد کر پھوٹ پھوٹ کر روتی۔

اس طرح روتے بلکتے شام ہوگئی۔ دیارام گاڑی لے آیا۔ میں سٹیشن پر پہنچی درجہ اول کے ڈبے میں ایک عورت ایک مرد اور تھے۔ میں نے ان لوگوں کے چہرے پر نظر ڈالی۔ اور ایک خالی بنچ پر جا کر بیٹھ گئی۔ کافی دیر تک گاڑی الہ آباد سٹیشن پر کھڑی رہی۔ خواہش ہوتی تھی کہ میں گاڑی سے اتر پڑوں۔ اور والد

صاحب کے پاس جاکر صاف صاف لفظوں میں کہہ دوں میں نے خطا کی اس کی مناسب سزا بھوگنے کے لئے میں تیار ہوں میں گھر نہیں چھوڑ سکتی۔ مگر دوسرے ہی لمحہ گویا کوئی کان میں کہتا تو عصمت فروش ہے۔ بدچلن ہے۔ دنیا تیری اس خطرناک غلطی کو معاف نہیں کر سکتی۔

الہ آباد سے گاڑی چل پڑی۔ میں نے کسی انگریزی کتاب میں پڑھا تھا۔ کہ جس وقت لکھنؤ کے آخری نواب واجد علیشاہ کو لکھنؤ کی نوابی مسند سے اتار کر کلکتہ میں نظر بند رکھنے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ اس وقت واجد علیشاہ کی رعایا میں رنج کا سمندر اُمڈ پڑا تھا۔ جس وقت واجد علی شاہ اپنے محلوں سے آخری مرتبہ نکلے تھے تو ان کے محل سے نکلتے وقت ان کے کچھ گویوں نے جنہیں واجد علیشاہ نے اپنی فراخ دلی سے مالا مال کر دیا تھا۔ کبیر صاحب کا ایک بھجن گایا تھا۔ وہ راگ اتنا پُر درد اور رقت انگیز تھا۔ کہ سننے والے رو اُٹھے۔ ؎

آنگن تو پربت بھیا
ڈیوڑھی بھئی دیش
لے بابل گھر اپنا۔
میں چلی پیا کے دیش
بابل مورا نیہر چھوٹو جائے۔

نتھیٹر میں

میں کلکتہ پہنچ گئی۔ ایک دو دن نہیں بلکہ پورے دو سال مجھے کلکتہ میں رہتے گذر گئے۔ اس دوران میں گھر والوں کی محبت اور شوہر سے ملنے کی آرزو بہت پھیکی پڑ گئی تھی۔ مہیپ کمار نے خرچ کی تنگی نہیں ہونے دی۔ میری گود میں ایک پھول سا نازک بچہ کھیل رہا تھا۔ میں اسی کو دیکھ دیکھ کر جی رہی تھی کبھی اس کے لئے بستر تیار کرتی کبھی اس کے لئے ایک چھوٹا سا تکیہ تیار کرتی بچہ کی دیکھ بھال میں میرا دل ایسا لگ گیا تھا۔ کہ میں اپنے اوپر آئی ہوئی تمام آفات کو بھول گئی۔

مہیپ کمار کبھی کبھی کلکتہ آتے تھے اور خرچ پانی کا انتظام کر جاتے تھے مگر انہوں نے کبھی میرے گھر والوں کو یہ پتہ نہیں لگنے دیا۔ کہ میں زندہ ہوں ان کی زبانی معلوم ہوا۔ کہ میرے گھر سے چلے آنے کے بعد دوسرے دن میرا خط پڑھ کر میرے والد نے مہیپ کو بلایا۔ ان کی صلاح لی۔ ان کی صلاح سے یہ مشہور کر دیا گیا۔ کہ پریما نہاتے وقت گومتی میں ڈوب گئی۔ خواہ مخواہ دریا میں جال ڈلوا کر میری لاش کو ڈھونڈنے کی کوشش بھی کی گئی والد صاحب نے میرے شوہر کو بھی یہی بات کہہ سنائی۔ انہیں میں نے خط میں باتیں کہہ دی تھیں۔ پریاگ سٹیشن پر میں نے وہ خط ڈاک میں ڈال دیا تھا۔ انہیں وہ خط مل گیا تھا۔ مگر مہیپ کمار نے بتلایا۔ کہ انہوں نے اس خبر کو سن کر کچھ نہیں کہا۔ کئی شادی کے رشتے بھی آئے۔ مگر انہوں نے شادی کرنے سے انکار کر دیا۔ اپنے قابل پرستش دیوتا کی اس قربانی کی بات سن کر میرا سر شرم سے جھک گیا۔ کہاں

وہ اور کہاں بدچلن پرمیا!

مہیپ کمار پہلے تو کافی خرچ دیتے رہے۔ مگر دیارام کی زبانی معلوم ہوا۔ کہ ریاست میں جھگڑا چل رہا ہے مہیپ کی بھاوجہ ریاست کا تمام کاروبار اپنے چھوٹے بھائی کے سپرد کرنا چاہتی ہے۔ اس باعث دونوں بھائیوں کی آپس میں ناچاقی ہوگئی ہے۔ میں نے دل ہی دل میں سوچا کہ کہیں مہیپ کمار سے بکا یک خرچ ملنا بند نہ ہو جائے۔ اس لئے گذارے کا کوئی نہ کوئی انتظام کرنا چاہیئے۔ ایکٹرس بننے کی خواہش دل میں پھر عود کر آئی۔ کلکتہ میں بود و باش رکھتے ہوئے میں سینما دیکھنے کی کافی عادت ڈال چکی تھی۔ اکثر ہفتہ میں چار دن تو سینما ضرور ہی دیکھتی تھی۔ کتابوں کا مطالعہ کرنا اور سینما دیکھنا۔ یہی دو طریقے وقت گذارنے اور اپنا دُکھ بھول جانے کے تھے میں نے سوچا کہ اب مجھے سینما اور تھیٹر میں داخل ہونے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

اس دوران میں کلکتہ کی زندگی کا مجھے کافی تجربہ ہو گیا تھا۔ تھوڑی بہت بنگلہ زبان بھی سیکھ لی تھی۔ بنگلہ فلمیں میں اچھی طرح سے سمجھنے لگ گئی تھی۔ ٹھکریہ لیک اس وقت اتنی زیادہ آباد نہ تھی۔ جتنی اب ہے۔ اس وقت کلکتہ کے تقریباً تمام دولت مند اشخاص یا تو سیر کے لئے ایڈن گارڈن میں جایا کرتے تھے۔ یا وکٹوریہ میموریل۔ دیارام کو ساتھ لے کر میں ہر روز ایڈن گارڈن جانے لگی۔ میرا مدعا بھی تھا۔ کہ وہاں کسی نہ کسی فلم کمپنی کے مالک سے میرا تعارف ہو جائے گا تو ایکٹرس بننے میں کوئی مشکل پیش نہ آئے گی۔

ایڈن گارڈن میں روز میں ایک بنچ پر جاکر بیٹھ جاتی۔ تقریباً ۷½ بجے پہنچتی اور ۸½ بجے اٹھ کر چل دیتی۔ کئی مہینوں تک میرا یہی دستور العمل رہا۔ میری گود میں میرا بچہ رہتا تھا۔ اس باعث کسی معزز خاندان کی خاتون سمجھنے میں کسی کو

شک نہیں ہوتا تھا۔ ایک دن میں نے دیکھا۔ کہ دو تین نوجوان میرے پیچھے پیچھے آ رہے ہیں۔ وہ آپس میں کہہ رہے تھے "یار چیز اچھی ہے"

دوسرا۔ یہ بوڑھا خبیث کیوں شیطان کی طرح اس کے پیچھے رہتا ہے منحوس اسکے ساتھ نہ ہوتا تو میں دو باتیں ضرور کرتا؟"

تیسرا۔ مکان تو میں نے اس کا دیکھ لیا ہے۔ تیس روپے کا پٹرول جلا چکا ہوں مال پرائیویٹ ہے۔

پہلا۔ تم احمق ہو۔ جن رنڈیوں کا روزگار نہیں چلتا وہ اسی طرح اشتہار کیا کرتی ہیں دیکھا نہیں تھا بیلہ کو۔ تم کہتے تھے پرائیویٹ ہے۔ میں نے اس دن رکشا کا پیچھا کرتے لگا لیا۔ کہ سسری چت پور میں رہتی ہے یہ بھی انہیں میں سے کوئی ہوگی۔ لڑکا ہوگیا ہے اس کی وجہ سے خریدار کم ہوگئے ہونگے۔ اب نئے ڈھنگ سے اشتہار کر رہی ہے

دوسرا۔ ارے بھائی یہ مت کہو۔ ایسی اعلےٰ انگریزی بولتی ہے کہ سنکر طبیعت خوش ہو جاتی ہے۔

پہلا۔ انگریزی بول لینا کون سی بڑی بات ہے۔ سیکھ لی ہوگی۔ انگریزی بول کر ہمارے لالہ جیسے کم عقلوں کو پھنسانا بھی تو اعلےٰ ہنر ہے۔ اب آپ تھیٹریکل کمپنی کے مالک ہوئے ہیں۔ بھلا نئی نئی عورتیں آپکو نہ ملینگی۔ تو کیا ہمیں ملینگی۔

تیسرا۔ بھائی تھیٹر کا جھنجھٹ تو میں نے بے فائدہ ہی مول لیا۔ تب تو سوچتا تھا کہ تھیٹر کے مالک بن جانے پر نئی نئی ایکٹرسوں سے ملاقات ہوگی۔ روز مفت تماشہ دیکھنے کو ملے گا۔ اور ٹکٹوں کی فروختگی سے کافی روپیہ بھی آئے گا۔ مگر اب تو لینے کے دینے پڑ رہے ہیں۔ چھ۔ چھ روپیہ کا ہاؤس رہتا ہے۔ اور اس پر بھی پانچ پانچسو کے ہاتھی اس بدقسمت ڈائرکٹر نے باندھ رکھے ہیں۔ میرا تو ناک میں دم ہے۔ اگر کچھ عرصہ یہی حال رہا تو مجھے تھیٹر بند کرنا پڑے گا۔ دو ہزار روپیہ ہاؤس کا کرایہ اور چھ چھ

روپیہ کا ہاؤس۔

پہلا۔ اگر ایسی ایک نازنین تمہارے تماشہ گاہ میں آئے تو قسم خدا کی چاندی برسنے لگے چاندی۔

یہ لوگ اس طرح باتیں کر رہے تھے۔ جیسے وہ مجھے ہی سنا کر باتیں کر رہے ہوں میں نے ان لوگوں کو پہلے بھی کئی بار اپنے نزدیک آتے جاتے دیکھا تھا۔ کئی بار تو وہ میرے پاس ہی بنچ سے تھوڑے فاصلہ پر گھاس پر بیٹھ کر گپ شپ کرتے تھے دو چار مرتبہ انہوں نے بھوانی پور میں میرے مکان تک میرا تعاقب کیا۔ ان کی چھوٹی موٹر میرے مکان کے سامنے والے فٹ پاتھ پر گھنٹوں کھڑی رہی ہے۔

میں گھر جاکر سوچنے لگی۔ کہ اگر تھیٹر کے مالک اس نوجوان سے میری جان پہچان ہو جائے تو ایکٹرس بننے میں بڑی آسانی ہو۔ مگر واقفیت بڑھے تو کیسے۔ بڑھے دیارام ہی ایک ایسا شخص تھا۔ جس سے میں اپنے دُکھ سُکھ کی باتیں کہہ دیا کرتی تھی۔ اور اصل دیارام تھا بھی پورا دیارام۔ اس کے کوئی اولاد نہ تھی۔ اس باعث یا اپنے نام کے باعث دیارام کے دل کا بحرِ کرم ہمیشہ میرے لئے اُمڈا رہتا تھا۔ ایک دن میں نے دیارام سے کہا۔ ——— "دیارام چاچا! اگر میں تھیٹر میں ملازمت کرلوں تو کیسا ہو؟

——— ہاں بیٹی ٹھیک تو ہے مگر؟"

——— مگر کیا چاچا؟"

——— بات یہ ہے کہ؟"

——— "کیا بات ہے"

——— بات یہ کہ تھیٹر اور فلموں کا کام جن لوگوں کے ہاتھ میں ہوتا ہے وہ شریف آدمی کم ہوتے ہیں۔

——— میں تعلیم یافتہ ہوں اس لئے میرے ساتھ کوئی ایسی ویسی بات کرنے میں خوف کھائے گا۔

——— ارے نہیں پیسے والوں کے سامنے تعلیم یافتہ لوگوں کی کوئی قدر نہیں ہے وہ اپنے پیسے کے زور پر تعلیم یافتہ لوگوں کو ناکوں چنے چبواسکتے ہیں۔

——— چاچا مہیپ کمار خرچ کے لئے اب ہاتھ کھینچ رہے ہیں ان کی اب آمد و رفت بھی کم ہو گئی ہے۔

پہلے جہاں مہینے میں ان کا ایک چکر ضرور ہوتا تھا اب تین چار مہینے میں ایک چکر لگتا ہے۔ پہلے بغیر مانگے روپئے بھیجے جاتے تھے۔ وہاں اب بار بار لکھنے کے بعد روپے آتے ہیں۔ ایشور نہ کرے کہیں انہوں نے مدد دینا بند کر دیا تو ہما سے اوپر کیا گذرے گی۔ مہیپ کمار عاشقانہ طبیعت کے آدمی ہیں۔ کچھ دنوں تک راجکماری ان کے لئے سب کچھ تھی۔ وہ اس کے ساتھ شادی کرنے کا ارادہ رکھتے تھے مگر مجھے پاکر انہوں نے راجکماری کو چھوڑ دیا۔ اب اگر کوئی اور لڑکی ان کی نظر میں چڑھ گئی۔ تو پھر ہم لوگوں کو بھوکوں مرنے کی نوبت آجائیگی۔ اس لئے چاچا! اگر تمہاری اجازت ہو تو میں کسی تھیٹر یا فلم میں کام کرلوں تم نے دیکھا ہوگا۔ ایک چھوٹی موٹر کار کبھی کبھی ہم لوگ جس ڈرامو سے میں جاتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ وہ ایک تھیٹر کے مالک ہیں۔ جو بھدی سی شکل کا نوجوان اس موٹر میں بیٹھا رہتا ہے۔ وہ ایک تھیٹریکل کمپنی کا مالک ہے۔ تم چاچا اگر ذرا کوشش کرتے تو مجھے نوکری ملجاتی" تم بیٹی جس میں سکھی رہو اسکے کرنے میں اس بوڑھے کو ذرا بھی عذر نہ ہوگا۔ مجھے خوف صرف اسی بات کا ہے۔ کہ تم پھر کہیں پھسل ......"

یہ کہتے کہتے دیارام چاچا کمرے کے باہر چلے گئے میں نے بچے کو گود میں اٹھالیا اور اسے پچکارنے لگی۔

فرقت زدہ سیتا

دیارام چاچا نے نہ جانے کس طرح سیٹھ لکشمی نرائن کو پانی پانی کر دیا کہ ایک دن وہ اپنا بھاری بھرکم جسم لیکر میرے یہاں آدھمکے۔ ایڈن گارڈن میں ان کو میں کئی بار دیکھ چکی تھی۔ اس باعث پہچاننے میں ذرا بھی دقت نہ ہوئی۔ سیٹھ صاحب چاچا والے کمرے میں آکر کرسی پر بیٹھ گئے پہلے ان کی آمد کی اطلاع دیارام چاچا سے مل چکی تھی۔ پہلے تو مجھے حیا نے اس کے سامنے جانے سے روکا۔ پھر مستقبل کی امید نے آگے بڑھنے پر مجبور کیا۔ میں نے دونوں ہاتھ جوڑ کر نمسکار کیا۔ وہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ میں اُنکے سامنے ہی کرسی کھینچکر بیٹھ گئی۔

کافی عرصہ تک ہم دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ پھر مہر خاموشی توڑتے ہوئے سیٹھ صاحب نے کہا۔ میری کمپنی کے لئے ایک ایکٹرس کی ضرورت ہے ایکٹرسوں کی تو کمی نہیں ہے۔ مگر میں ذرا مذہبی خیالات کا آدمی ہوں جنک نندنی سیتا کے پارٹ کو میں کسی رنڈاصہ سے نہیں کروانا چاہتا۔ کہاں جگدمبا تا سیتا اور کہاں ایک رنڈاصہ!

یہ کہہ کر وہ کچھ دیر کے لئے چپ رہ گئے۔ جب میری طرف سے کچھ جواب نہ ملا۔ تو انہوں نے پھر اپنی بات کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا "کیا کیا جائے؟ معزز خاندان کی لڑکیاں سٹیج پر آنا ہی نہیں چاہتیں۔ میں نے لاکھ کوشش کی۔ زیادہ سے زیادہ تنخواہ دینے کا لالچ دیا۔ مگر ایک بھی لڑکی سٹیج پر کام کرنے کے لئے تیار نہ ہوئی"

"دیکھئے مجھے صاف کہنے کے لئے آپ معاف فرمائیں۔ ہمارا ہندوستانی تھیٹر اتنا گرا ہوا ہے۔ کہ کوئی معزز خاتون اس میں آنے کا حوصلہ نہیں کر سکتی"، میں نے کہا۔

"اگر اس میں خرابیاں ہیں تو انہیں دور کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے اس کا یہ مطلب نہیں کہ تھیٹر ہی بند کر دیا جائے"

"مگر سوال تو یہ ہے کہ تھیٹر میں اصلاح کرنے کا ارادہ کر کے کون آگے بڑھے؟"

"آگے تو کسی کو آنا ہی پڑے گا۔ آپ اس حالت میں قدم بڑھانے کے لئے تیار ہیں مجھے یہ جانکر نہایت خوشی ہوئی۔ بھائی دیارام صاحب کی زبانی معلوم ہوا کہ آپ کافی تعلیمیافتہ ہیں اس باعث مجھے کامل یقین ہے۔ کہ فرقت زدہ سیتا کا پارٹ ادا کرنے میں آپ کو کامیابی نصیب ہوگی۔ کیا کبھی آپ کو کسی ناٹک میں پارٹ کرنے کا موقع ملا ہے؟"

"ہاں ملا ہے۔ جب میں کالج میں پڑھتی تھی۔ تو کالج کے ڈراموں میں حصہ لیا کرتی تھی۔ کالج کے ڈرامے میں اور آپ کے سٹیج کے ڈرامے میں فرق ہے۔ میں کامیابی حاصل کرنے کی کوشش کروں گی"

"کمپنی ابھی نقصان میں چل رہی ہے۔ اگر ہمارا یہ ڈرامہ پاس ہو جائے بس بیڑا پار ہے"

"——— بھگوان کی مرضی! میں حتی المقدور کوشش کروں گی"

"——— تو کل آپ ہمارے دفتر میں آنیکی تکلیف کریں۔ یوں تو کوئی بات نہیں ہے۔ مگر یہ پیشہ ایسا ہے۔ کہ اس میں بغیر معاہدہ کے کام نہیں چلتا زیادہ تر دیکھا یہ جاتا ہے کہ ایک ایکٹرس آج ہماری کمپنی میں کام کر رہی ہے۔ جو ہم سے عداوت رکھتے ہیں۔ وہ اسے اپنی طرف کھینچکر ہمیں برباد کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ آپ کل دفتر میں آجائیں۔ وہاں آکر معاہدہ پر دستخط کر دیں میں ایکٹرسوں کی تنخواہ میں کبھی بھی گول مال نہیں ہونے دیتا۔ ہر ایک ماہ میں آپ کو تنخواہ پیشگی ملتی رہے گی"

یہ کہہ کر سیٹھ لکشمی نارائن اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ میں بھی کھڑی ہو گئی۔ میں سیڑھیوں تک انہیں پہنچانے آئی۔ چلتے وقت انہوں نے مجھے اپنے دفتر کا پتہ بتا دیا۔ اور موٹر بھیجدینے کا وعدہ کیا۔ ان کے نیچے اترنے پر میں برآمدے میں آ کر کھڑی ہو گئی۔ جب تک ان کی موٹر آنکھوں سے اوجھل نہ ہو گئی میں وہیں کھڑی رہی۔

دوسرے دن مقررہ وقت پر موٹر مجھے لینے کے لئے آ گئی۔ بچہ سو رہا تھا۔ اس لئے دیا رام چاچا کو گھر پر چھوڑ کر میں تھیٹر کی طرف چلی۔ ایک عظیم الشان دو منزلہ مکان کے سامنے جا کر موٹر ٹھہر گئی۔ ایک نوجوان نے گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ میم صاحب! یہی کمپنی کا دفتر ہے۔ میں کھٹ کھٹ سیڑھیوں کو عبور کرتی اوپر پہنچ گئی۔

سیٹھ لکشمی نارائن نے دروازے پر ہی میرا استقبال کیا۔ وہ مجھے ایک بڑے کمرے میں لے گئے جس میں آٹھ دس بڑے بڑے کوچ پڑے ہوئے تھے۔ عجب مجمع لگا تھا۔ کچھ لوگ لنگی لگائے ایک کونے میں ہارمونیم پر کچھ گا رہے تھے۔ دو عورتیں چوڑی دار پاجامہ پر اوڑھنی اوڑھے ہاتھ میں اردو میں لکھے ہوئے کچھ مضمون پڑھ رہی تھیں۔ سیٹھ صاحب نے بتلایا کہ یہ ریہرسل ہو رہا ہے۔ کچھ دیر ہم لوگوں نے ایک صوفے پر بیٹھ کر ریہرسل سنا۔ اس کے بعد سیٹھ صاحب ڈانس روم یعنی ناچ گھر کی طرف لے گئے۔ میں نے دیکھا کچھ گوری چھوکریاں ناچنے کی مشق کر رہی تھیں وہ ہندی زبان اچھی طرح نہیں بول سکتی تھیں۔ اس لئے سیتا "کو "سِٹا" کہہ کر بول رہی تھیں۔ تھیٹریکل کمپنی کے مالک اور ڈائرکٹر کی اس عجیب عقل پر مجھے ہنسی آ رہی تھی۔ کہاں تو رام چندر کے زمانے کا ہندوستان اور کہاں گوری چھوکریوں کا ناچ اور گانا۔

آخرکار سیٹھ صاحب مجھے دفتر میں لے گئے۔ کمپنی کے ڈائرکٹر صاحب وہیں تشریف رکھتے تھے۔ سیٹھ صاحب نے میرا ان سے تعارف کرایا۔ سیتا کا پارٹ لکھا ہوا پہلے ہی رکھا تھا

اُسے انہوں نے مجھے دیتے ہوئے کہا۔ آپ تعلیمیافتہ ہیں۔ آپ کو یاد کرنے میں خاص وقت نہ ہوگی۔ آپ اگر دن میں گھنٹہ دو گھنٹہ کے لئے ریہرسل میں اپنا کچھ وقت دے سکیں تو بہت اچھا ہو۔ میں بھی تھوڑی بہت آپ کی کھیل کے ڈائرکشن میں مدد کرونگا۔

" بہت اچھا،، کہہ کر میں نے ان کی باتوں کا جواب دیا۔ شاید انہوں نے میرا فوٹو لینا تھا۔ انتظام پہلے سے ہو چکا تھا۔ کیونکہ معاہدہ پر دستخط کرنے کے بعد ہی سیٹھ صاحب نے مجھ سے کہا اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو آپ کے دو ایک فوٹو لے لئے جائیں جن سے کل کے اخبار میں انہیں شایع کرایا جا سکے۔ میں نے فوٹو کھچوانے سے صاف انکار کر دیا۔ میں نے سیٹھ صاحب سے کہا۔ ابھی فوٹو نکالنے کی کیا ضرورت ہے؟ جب ایک بار سٹیج پر کام کر لیجئے دیکھئے اگر میں درست طور پر اپنا پارٹ ادا کر سکی تو پبلک ویسے ہی میرا لوہا مان جائیگی۔

پھر بھی فوٹو کا لوگوں پر اثر پڑتا ہے۔ مگر اگر آپ ———— ہاں سیٹھ صاحب نے کہا۔

انہوں نے بہت زور دیا مگر میں فوٹو کھچوانے کے لئے تیار نہ ہوئی۔ آخر کار سیٹھ صاحب نے کہا مسٹر حسین کو بلاؤ۔

تھوڑی دیر کے بعد سوٹ زیب تن کئے ایک صاحب آئے ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ آپ نے سیٹھ صاحب کو فرشی سلام بجا لاتے ہوئے کہا" حکم

" دیکھو حکم وکم کوئی نہیں۔ کل سے ناٹک کا اتنے زوردار الفاظ میں اشتہار شایع کرو کہ کمپنی کا نام گھر گھر میں پہنچ جائے۔ سمجھے اسیتا کا پارٹ مس ملا دیوی کرینگی۔ ان کا نام اخبار میں نکلے اور بڑے بڑے حروف میں نکلے۔ اور دیکھو اخبار والوں سے کہہ دو کہ جہاں ہمارا اشتہار نکلے اسجگہ بیڑی والوں کا اشتہار نہ نکلے۔ سمجھے "

" بہت بہتر،، ان کا جواب تھا سیٹھ صاحب نے پھر کہا" میاں حسن! ہم نے تمہیں بیکار نوکر رکھا ہے۔ تم ہندی نہیں جانتے ہو۔ ہندی کا کھیل۔ تم اشتہار کیا لکھو گے

خاک؟"

"سب ٹھیک ہو جائیگا۔ آپ فکر نہ کریں" ڈائرکٹر صاحب نے کہا۔

تھیٹر میں مجھے فرقت زدہ جلاوطن سیتا کا پارٹ کرنا تھا۔ رام نے اپنی جان سے پیاری سیتا کو ایک دھوبی کے ذریعہ لگائے ہوئے الزام کے باعث جلاوطن کر دیا تھا سیتا کو لکشمن بالمیکی کے آشرم میں چھوڑ کر چلے آئے تھے۔ وہاں حاملہ سیتا نے اپنی مصیبت کے دن گذارے۔ کس طرح پھر سیتا اور رام کا ملاپ ہوا۔ ناٹک کے ذریعہ یہ ظاہر کرنا مطلوب تھا سیتا کی اور میری حالت یکساں تھی۔ مگر اس میں تھوڑا فرق تھا۔ جلاوطن سیتا کا اپنے پریتم رام سے دوبارہ ملاپ ہوا تھا۔ مگر بدقسمت پربھا کے رام کا ملاپ کہاں؟ فرقت زدہ سیتا کے بالمیک کوی تھے۔ میرے بالمیک چاچا دیا رام تعلیمیافتہ نہیں تھے۔ مگر انکے دل میں رحم کا چشمہ بہ رہا تھا۔

پہلے ہی دن میرا پارٹ دیکھ کر پبلک بہت محظوظ ہو گئی۔ جسوقت میں نے بن میں پہنچانے والے لکشمن سے رو کر کہا "بیٹا لکشمن! تم نے بھگوان رام سے جاکر کہنا۔ کہ انکی سیتا بن میں سکھی ہے۔ اس کے راج کو جس میں سکھ ہے وہی سیتا کا سکھ ہے۔ تو سامعین کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ میں پارٹ کرتے وقت بھول گئی کہ میں سیتا کا پارٹ کر رہی ہوں۔ مجھے تو یہ معلوم دیا جیسے میرے ہی اصلی زندگی کا کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ فرق اتنا ہی تھا کہ پتی پرائن سیتا ستی ساوتری تھی۔ اور بدقسمت پربھا نے محبت کا کھیل کھیلا تھا۔ جس میں وہ کھیل پڑی تھی۔

کھیل ختم ہونے کے بعد میں گھر آئی۔ چاچا گہری نیند میں سو رہا تھا۔ میں آکر لیٹ گئی میرے سکھ سوہاگ کی وہ تھوڑی سی راتیں میری آنکھوں کے سامنے آکر ناچنے لگیں دل بیچین ہو اٹھا۔ سوچنے لگی نہ جانے ان پر کیا گذری ہوگی؟ وہ کہاں ہوں گے؟

میں نے اس خیال میں بچے کو سینے سے لگاتے ہوئے کہا "میرے رام تم کہاں ہو۔

پھر محبت کا جال

تھیٹریکل کمپنی میں کام کرتے کرتے مجھے ڈیڑھ سال ہوگیا۔ اس طویل عرصہ میں مہیپ کمار صرف ایک بار کلکتہ آئے۔ خرچ بھیجنے کی رفتار ان کی دھیمی پہلے ہی پڑ گئی تھی جب انہیں معلوم ہوا کہ میں تھیٹر میں کام کرنے لگی ہوں تو ان کی توجہ میری جانب سے اور بھی کم ہوگئی۔ ان کے ناراض ہوجانے کا ایک اور بھی باعث تھا۔ مہیپ کمار نے تو نہیں بتایا مگر دیارام چاچا کی زبانی مجھے معلوم ہوگیا کہ مس راجکماری سے اُن کی محبت آج کل زوروں پر ہے۔ ویسے مہیپ کمار جب کبھی کلکتہ آتے تھے میرے یہاں ٹھہرتے تھے۔ مگر آخری بار جب وہ آئے۔ تو میرے یہاں نہ ٹھہر کر کسی ہوٹل میں ٹھہرے۔ اس کا بھی یہی سبب تھا۔ ہر بار وہ تنہا آیا کرتے تھے مگر اس مرتبہ وہ اپنی نئی معشوقہ کو ساتھ لائے تھے۔ پہلے وہ مجھے اپنے ساتھ بائیسکوپ دکھلانے کے لئے لے جاتے تھے۔ مگر اس مرتبہ میرے اصرار کرنے پر بھی انہوں نے ٹال دیا۔ دس بارہ دن رہ کر مہیپ کمار چلے گئے۔

اب مجھے مہیپ کمار کی فکر نہ تھی۔ اب میں ایکہزار روپیہ تنخواہ پانے والی تھیٹر کی ایک مشہور ایکٹرس تھی۔ تمام شہر میں میرے تھیٹر کے فن کی دھوم مچ گئی تھی ہر کسی کی زبان پر میرا نام تھا۔ اب میرے یہاں ایک نیپالی دربان ہمیشہ پہرے پر رہتا تھا۔ جو بغیر اجازت حاصل کئے کسی کو گھر کے اندر قدم نہیں رکھنے دیتا تھا۔ مہیپ کمار کے جانے کے بعد میں نے بھوانی پور چھوڑ کر لیک کے پاس ایک دو منزلہ مکان کا بالائی حصہ کرایہ پر لے لیا۔ دروازے پر ایک سائن بورڈ لگوا دیا گیا جس میں پیتل کے موٹے حروف میں میرا نام کندہ تھا۔ ایک جگہ

اُن (دھنا) اور اوٹ لگا دیا جس وقت میں باہر جاتی اس وقت بورڈ پر لگا رہتا اوٹ (دھنا) اور جب گھر میں رہتی تو لکھا رہتا ان (دھنا) کبھی کبھی جب میری طبیعت اُداس ہو جاتی۔ تو میری دوستوں کے ساتھ کھیلنے کی خواہش ہوتی۔ تو میں گھر میں رہتے ہوئے بھی دربان سے کہہ دیتی کہ اگر کوئی ملنے کے لئے آئے تو کہہ دینا "بیگم صاحبہ باہر تشریف لے گئی ہیں" وہ اِن ہٹا کر اوٹ کر دیتا۔

میری شہرت تمام کلکتہ میں پھیل گئی تھی۔ میرے پاس ہر روز سینکڑوں خطوط میرے ہنر کی تعریف میں آیا کرتے تھے۔ نہ جانے کتنے لوگ کہتے۔ سینما کا ایک خوبصورت پارٹ دیکھ کر بنگالی سٹیج والے بھی کان ٹیک جائیں گے سیٹھ لکھشمی نارائن کی عزت وتوقیر کا کیا کہنا؟ ہر روز نئی چیزیں بطور تحفہ بھیجی جاتیں۔ تیو ہار پر ریشمی ساڑھیاں اور پھل آتے۔ یوں تو سیٹھ صاحب ایک نمبر کے بدمعاش اور دل پھینک طبیعت کے آدمی تھے۔ مگر میری نسبت نہ جانے ان کے دل میں کیوں عزت کا جذبہ پیدا ہو جاتا تھا۔ ان کا آبنوس کا چہرہ مجھے دیکھتے ہی کھل اُٹھتا تھا۔ انکی تھیٹریکل کمپنی چل نکلی تھی۔ اور اس کا باعث میرا تھیٹر کے فن میں کمال تھا یہ بات سیٹھ صاحب بھی جانتے تھے۔

سیٹھ صاحب کے چلن کا تذکرہ ایکٹرسوں میں خوب ہوا کرتا تھا۔ کبھی کبھی تو کسی ایکٹرس کے سامنے عجیب سوال آجاتا تھا۔ رات کے تقریباً ایک بجے کھیل ختم ہوا ایکٹرس پوشاک بدلکر باہر نکلی اور سیٹھ صاحب نے کہا گھر جارہی ہو۔ ٹھیک ہے۔ میں بھی آج آپ ہی کے یہاں آرہا ہوں۔ پھر کیا تھا۔ اپنے دو چار بدمعاش دوستوں کو لے کر سیٹھ صاحب وہاں پہنچ جاتے ایکٹرس اُن کی کمپنی میں ملازم ہے مالک کی حکم عدولی کرنا مناسب نہیں ہے۔ بیچاری کرے تو کیا؟ دوسری عورتیں میرے سامنے اکثر سیٹھ صاحب کی شکایت کیا کرتی تھیں۔ انہیں حیرت ہوتی تھی۔ کہ

سیٹھ صاحب سا عیاش شخص میرے ساتھ اتنی تہذیب کے ساتھ سلوک کیوں کرتا ہے۔

ایک دن تماشہ ختم ہونے پر جب میں گھر واپس آئی۔ تو دیا رام چاچا نے ایک خط مجھے دیا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا۔ کہ کوئی خط دیکر چلا گیا ہے۔ اور کہہ گیا ہے کہ خط بہت ضروری ہے اور جس وقت میں آؤں اسی وقت مجھے دیدیا جائے میں نے خط کھولا اس میں لکھا تھا۔

میری.....

"اس خاکسار کو آپ نہیں جانتیں۔ مگر یہ خادم مہینوں سے آپکی خدمت بجا لا رہا ہے۔ خدمت کر رہا ہے۔ مگر پوشیدہ طریقے سے کسی کی بڑی بڑی آنکھیں ہوں۔ چہرہ گول ہو۔ جثہ میں مستی۔ چال میں چلبلاہٹ ہو۔ اور پھر وہ کوئی بیس سال کی خوبصورت عورت ہو تو کس کا دل اس کی طرف مائل نہ ہوگا۔ آپ کو تھیٹر میں میں نے ایکٹنگ کرتے دیکھا ہے بس اس دن سے میری پریشانی کی کوئی حد نہیں۔ ہاؤس سے نکل کر جب میں گاڑی میں بیٹھ گیا۔ تو آپکی دلفریب صورت میری آنکھوں کے سامنے تھی۔ آپ کی آواز میرے کانوں میں گونج رہی تھی۔ اس دن رات کو میں اچھی طرح سو نہیں سکا۔ اپنے دل کا راز آپ کے سامنے کھولکر رکھ دیا ہے۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو شام کو پانچ اور چھ بجے کے درمیان گرینڈ ہوٹل میں مندرجہ ذیل نمبر پر فون کر سکتی ہیں۔ یہ لکھنا تو شاید بیکار ہوگا کہ پانچ سے چھ بجے تک میں ضرور ہی آپ کے فون کا انتظار کروں گا۔"

خط کی زبان بتلا رہی تھی کہ اس کا تحریر کنندہ کوئی مسلمان ہے۔ مورتی کو مورت لکھنا ہی اس بات کا کافی ثبوت تھا کہ خط کا تحریر کنندہ کوئی اردو دان ہے خط سے یہ بات بھی ظاہر ہوتی تھی۔ کہ لکھنے والا کوئی معزز شخص ہے اور اُس کے پاس اپنی

موٹر گاڑی ہے۔ یہ خط لکھنے والا کون ہے۔ اس طرح کا خط بھیجنے کا کیا سبب ہے وغیرہ باتیں سوچتے سوچتے میں سو گئی۔

صبح اٹھ کر میں چائے کا پیالہ منہ سے لگا رہی تھی کہ ٹیلی فون کی گھنٹی جھنجھنا اٹھی میں نے فون اٹھایا۔ کسی نے پوچھا "مس بلا ہیں"

——— "جی ہاں"

——— "مجھے ان سے کچھ باتیں کرنی ہیں"

——— "کہیئے میں ہی ٹیلیفون پر بول رہی ہوں"

——— کل آپ کو ایک خط ملا تھا؟

——— جی ہاں!

——— آپ کی ایکٹنگ دیکھ کر طبیعت باغ باغ ہو جاتی ہے۔

——— "آپ کی قدر دانی ہے"

——— اگر ولایت میں آپ نے اس خوبصورتی کے ساتھ پارٹ ادا کیا ہوتا؟ تو آپ کی شہرت تمام دنیا میں پھیل جاتی۔ مگر یہ ہندوستان ہے"

——— "مگر آپ کون ہیں"

اس سوال کے جواب میں جو کچھ میں نے سنا اسے سنکر میں دنگ رہ گئی۔ ایک بہت بڑی ریاست کے نواب صاحب بات کر رہے تھے۔ اب میں کچھ اور بھی خبردار ہو کر ذرا ڈھنگ سے بات کرنے لگی۔ انہوں نے پھر سوال کیا۔

——— کیا سنیچر وار کو ہوٹل میں میرے ساتھ چائے پر آنے کی تکلیف گوارا کر سکیں گی۔

——— "بھلا آپ دعوت چلئے پر مجھے مدعو کریں اور میں حاضر نہ ہوں یہ کبھی ممکن ہے"؟ میں نے کہا۔

—— شکریہ!"

فون میں مجھے جان پڑا کہ ٹیلیفون کرنے والا میرا جواب سنکر بہت خوش ہوا اس نے جسطرح شکریہ کے الفاظ کہے ان سے جان پڑتا تھا۔ جیسے برسوں کی ریاضت کا اجر اسے اب مل گیا ہے۔

—— "تو سنیچروار کو گرینڈ ہوٹل میں شام کو چھ بجے تشریف لایئے میں آپ کا انتظار کروں گا"

—— "ضرور حاضر خدمت ہوں گی"

مجھے معلوم دیا جیسے وہ کچھ دیر تک اور باتیں کرنا چاہتا ہے۔ مگر اسے کوئی ایسا مضمون نہیں ملتا۔ جس پر وہ گفتگو کرے۔ ادھر وہ کچھ سوچ رہا تھا۔ اور ادھر میرا دلو دآ گیا۔ اس لئے میں نے ٹیلیفون رکھ دیا۔ اور دلو کو گود میں لے کر تھرک تھرک کر گانے لگی۔

پریم کیا دُکھ پایا پگلے — پریم کیا دکھ پایا۔
پریم کا جس نے دیا جلایا — اپنا جیون دیئے بجھایا
پریم نگر میں پریم ڈگر میں — یہی ہے ہوتا آیا۔ پگلے
پریم کی بینا مرگ پھنسایا — پریم پتنگا نے پران گنوایا
پریم کی اگنی جس تن لاگی — وہ تن پھونک جلایا۔ پگلے
پریم نے مایا جال بچھایا — اس مایا نے من بھرمایا
پریم کے کانٹے پر پریمی نے — پھول کا دھوکا کھایا۔ پگلے

میرا نیا شوق

تھیٹر میں کافی شہرت حاصل کر لینے کے بعد فلم ایکٹرس بننے کی خواہش دن بدن بڑھتی جا رہی تھی۔ میں نے تھیٹریکل کمپنی میں کام کر کے کافی شہرت حاصل کر لی تھی سیتا کا کامیاب پارٹ ادا کرنے کے بعد میں بیلے بنی تھی۔ شیریں بنی تھی۔ دمینتی بنی تھی اور ایک نئے ڈرامہ کی ناکام معشوقہ کا پارٹ ادا کر چکی تھی۔ میں نے اپنے پارٹ میں دیکھا کہ کسی بدقسمت ہندو عورت کا پارٹ ادا کرنے میں مجھے جتنی کامیابی نصیب ہوتی تھی اتنی کامیاب معشوقہ بننے میں نہیں۔ اس کا باعث شاید میری ناکام محبت ہی تھی۔

تھیٹریکل کمپنی ہو یا فلم کمپنی دونوں جگہ خوبصورتی کو اول درجہ دیا جاتا ہے۔ اور اگر کوئی حسینہ تعلیم یافتہ ہو تو پھر کہنا ہی کیا؟ تھیٹریکل کمپنی میں مسلمانوں کی تعداد زیادہ تھی۔ بڑی ہرسل روم میں سرخ لنگی لگا کر ریہرسل کرنے والے ایکٹروں کو دیکھ کر کبھی کبھی یہ خواہش ہوتی تھی کہ تھیٹر کے کام کو آج ہی چھوڑ دوں۔ مگر روپیہ ایسی چیز ہے جس کی وجہ سے خواہش رہتے ہوئے بھی کمپنی چھوڑنے کا حوصلہ نہ ہوتا تھا۔

فلم ایکٹرس بننے کی میری خواہش زبردست ہوتی جا رہی تھی۔ کبھی کبھی آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھ کر میں خود بخود کہنے لگتی نورما شیرر سے میری آنکھیں کم خوبصورت نہیں ہیں۔ مارلن ڈائٹرچ کے سڈول جسم سے میرا جسم کسی بھی حالت میں کم نہیں ہے۔ یہ انیامے لوگ کی طرح میری ہونٹوں کی حرکت پر دنیا رجھ سکتی ہے۔ پرلیس مور کی مانند میرے نازک گلے کی آواز پر دنیا دیوانی بن سکتی ہے۔ ہندوستانی ایکٹرسوں کے ہنر پر تنقید بھی کبھی کبھی میں کیا کرتی سلوچنا کی خوبصورتی۔ سوتیا کی شکل و شباہت

گوہر کی آنکھوں کی کشش۔ اما شسٹی کے گلے کی نازک آواز میں ایسا کیا جادو ہے جو مجھ میں نہیں ہے۔ اس وقت تک کانن بالا اور شانتا آپٹے نے فلمی دنیا میں اتنی شہرت حاصل نہ کی تھی۔ اس باعث ان کے متعلق کسی طرح کا خیال میں نے بنایا نہیں تھا۔ مگر مندرجہ بالا جن ایکٹرسوں کا ذکر کیا ہے۔ ان میں اپنے کو کسی بات میں کم نہ سمجھتی تھی۔

میری صرف یہی خواہش ہو رہی تھی۔ کہ میرا خوبصورت چہرہ سینما کے پردے پر جاکر چمک اُٹھے۔ میرا نام بجلی کی روشنی سے منور ہو کر چمک جائے میرا لیٹر بکس میرے ہنر کے دلدادوں کی عشقیہ خطوط سے بھر جائے۔ مگر میری یہ فلم ایکٹرس بننے کی خواہش اُمیدی کے جھولے پر جھول رہی تھی۔ کیونکہ ادھر فلم کمپنی میں داخل ہونے کا میرے پاس کوئی وسیلہ نہ تھا۔ سیٹھ لکشمی نارائن نے کچھ دوستوں کے ذریعہ فلم کمپنیاں چل رہی تھیں۔ مگر سیٹھ صاحب اپنی خود غرضی کے باعث ان لوگوں تک میری رسائی نہیں ہونے دیتے تھے۔ کیونکہ انہیں خوف تھا۔ کہ کسی فلم کمپنی کے مالک سے واقفیت ہوتے ہی میں تھیٹریکل کمپنی کو خیرباد کہہ کر وہاں چلی جاؤں گی۔

ہمارے یہاں کبھی کبھی ایک میاں صاحب آیا کرتے تھے۔ کافی تعلیمیافتہ تھے ہمارے یہاں پبلسٹی میں کام کرنے والے مسٹر حسین ان کے دور کے رشتہ دار تھے بات چیت کے سلسلہ میں ایک دن معلوم ہوا۔ کہ وہ ایک فلم کمپنی میں پبلسٹی آفیسر (انچارج محکمہ اطلاعات) ہیں۔ مجھے منہ مانگی مراد ملی۔ میں نے ان سے میل جول بڑھایا ایک دن انہیں اپنے گھر پر دعوتِ چائے دی۔ میں نے چائے کا پیالہ ان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "کیوں مرزا صاحب! اگر میں کسی فلم کمپنی میں کام کروں تو کیا ہو"

———— "کیا یہاں کوئی شکایت ہے"

———— "جی نہیں" میں نے کہا۔

——— "میری رائے میں تو آپ یہیں رہیں تو بہتر ہے۔"

——— "مجھے یہاں کے لوگوں سے کچھ رنجش سی ہو گئی ہے یہ لوگ ایسے ایسے واہیات نظارے دکھلاتے ہیں۔ کہ کبھی کبھی تو خواہش ہوتی ہے کہ اُٹھ کر چلی جاؤں۔ سٹیج پر سرِ عام عورتوں کا بوسہ لینا۔ انہیں بار بار سینے سے لگا لینا۔ انہیں گود میں اٹھا کر لے جانا۔ عورتوں کا آہ..... اوئی وغیرہ کہنا ایسی بیہودہ باتیں ہیں کہ جنہیں میں پسند نہیں کرتی

——— "آپ کو اس طرح کا پارٹ کرنا نہیں پڑتا۔ تو پھر آپکو کیوں اعتراض ہے پبلک جیسی چیز چاہتی ہے تھیٹر والے ویسی ہی چیز دیتے ہیں۔"

——— "پبلک اب اتنی نادان نہیں رہی۔ سیتا کے دن کیسی بھیڑ رہتی ہے۔ لوگ تماشہ دیکھنے آتے ہیں کوک شاستر کے نظارے نہیں۔"

——— "مگر کمپنی والے کیا کریں؟ وہ تو وہی چیز دکھلاتے ہیں جس سے چار پیسے کی آمدنی ہوتی ہے۔ فلموں میں بھی تو یہی ہوتا ہے۔

میں نے حیرت سے منہ پھاڑتے ہوئے کہا۔ "اچھا تو کیا وہاں کا معاملہ بھی بعینہٖ اسیطرح کا ہے؟"

"جی ہاں" مرزا صاحب نے چائے کے پیالے کو میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ سگرٹ کا پیکٹ جیب سے نکالا۔ انہوں نے دھواں اڑاتے ہوئے کہا۔ میرے پاس تو فلم میں کام کرنے کے لئے اکثر بہت سے لوگ آیا کرتے ہیں۔ ہمیں تو فلم کمپنیوں میں کام کرنے والے کی خواہش رکھنے والی لڑکیوں سے روزانہ پالا پڑا کرتا ہے۔ میں آپ کو اپنا ایک تجربہ سناتا ہوں۔

فلم کے بیوپاریوں سے جن لوگوں کا تعلق ہے۔ انہیں اس قسم کی نازنینوں کے

گروہ گھیرے رہتے ہیں۔ کچھ دن پہلے کی بات ہے۔ میرے ایک واقف شخص نے ایک فلم کمپنی کھولی۔ اور مجھے پبلسٹی کا کام سونپ دیا۔ فلم میں کام کرنے والی ایکٹرسوں کے پارٹ کی تعریف کرکے شہریوں کی توجہ اس فلم کی طرف مبذول کرنا میرا کام تھا مگر حسین ماہ لقا لڑکیوں کے مجمع نے مجھے پریشان کر دیا دن بھر سٹیڈیو کی دوڑ دھوپ کے بعد رات کو گھر واپس آتا تو کسی نہ کسی لڑکی کو یا اس کے کسی لواحق کو انتظار میں بیٹھا پاتا۔ کوئی کہتی! آپ پبلسٹی آفیسر ہیں۔ آپ چاہیں تو مجھے فلمی دنیا میں چمکا سکتے ہیں میں بڑی اُمید لے کر آپ کے پاس آئی ہوں۔ آپ کی ذرا سی حوصلہ افزائی میری زندگی کی لہر کو بدل دیگی۔ کوئی نوجوان کہتا۔ ابھی تک کسی فلم میں کام کرنے کا موقع تو مجھے نہیں ملا ہے۔ مگر میں مذاقیہ پارٹ اتنی خوبصورتی سے کر سکتا ہوں کہ آپ چندر موہن کو بھی بھول جائیں۔ میں اس قسم کی خواہش رکھنے والے نوجوان ایکٹروں اور ایکٹرسوں کو اپنے یہاں آنے سے منع کرتے کرتے اُکتا گیا۔ ایک دو ہوں تو انہیں کام دلوا بھی دیا جائے مگر قافلے کے قافلے اگر سٹیڈیو میں بھرتی ہونے کے لئے چلے آئیں تو انہیں کیسے بھرتی کیا جائے؟ کوئی فوج تو ہے نہیں کہ کام پر گئی اور لڑ کر ختم ہو گئی۔ یہاں تو ایک عورت زندگی بھر ہیروین کا پارٹ کرنے کے لئے کافی ہے۔

میں جس کمپنی میں کام کرتا تھا۔ اس کے مالک بہت کاروباری آدمی تھے۔ کئی قسم کے بیوپاری ان کے یہاں ہوتے تھے۔ دوستوں کے کہنے سننے اور خود بھی راگ وغیرہ کے شوقین ہونے کے باعث یہ کام شروع کر دیا تھا۔ کام کو دیکھنے کی فرصت تو انہیں رہتی نہ تھی۔ اس لئے زیادہ تر کام میرے ہی ذمہ تھا۔ ایکٹرسوں کے انتخاب میں ڈائرکٹر کی مدد کرنا۔ انہیں وقت پر بلانا۔ ان کے بھیجنے کا انتظام کرنا وغیرہ تمام کام میرے ذمے تھے۔ ایک دن کا واقعہ ہے۔ شام کو جب میں سٹیڈیو سے گھر لوٹا۔ تو ایک

نازنین کو اپنے کمرے میں انتظار کرتے ہوئے پایا۔ اس کا چہرہ خوبصورت تھا۔ اس کے بالوں کی ایک زلف اس کے رخساروں پر پڑی ہوئی شہد نوش کرنے کے خیال میں غلطاں بھونرے کی طرح معلوم ہوئی۔ میرے پاؤں کی آواز سنکر وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ میں نے دیکھا اس کے چہرے پر حیا کی ایک ہلکی سی لکیر دوڑ گئی ہے۔ اس کے سڈول جسم کو دیکھ کر میں نے اپنے دل میں سوچا کہ یہ نوشگفتہ کلی سٹیڈیو کے دہکتے ہوئے آتش فشاں پہاڑ میں کود کر کیوں راکھ ہونا چاہتی ہے۔

اس نے عاجزانہ الفاظ اور نازک سر سے آداب بجالانے کے بعد کہا۔ میں آپکے نام ایک خط لائی ہوں۔

میں نے اس کے ہاتھ سے خط لے لیا۔ خط میرے ایک عزیز دوست کا تھا۔ اس کے پڑھنے سے پتہ چلا کہ لڑکی ایک شریف گھرانے کی ہے۔ والدین اعلےٰ تعلیم کے مخالف ہیں۔ اس لئے انہوں نے اس کو کالج میں داخل نہیں ہونے دیا لڑکی تعلیمیافتہ ہے۔ اور فلمی دنیا میں چمکنا چاہتی ہے۔ میں نے پوچھا "جان پڑتا ہے آج ہی وطن سے آئی ہو"

——— "جی ہاں!"

——— ٹھہرنے کا انتظام کیا؟

——— یہیں پاس ہی میں۔

——— پاس میں کہاں؟

——— یہی جو آپ کا کمرہ ہے۔

——— میں گھبرا گیا۔ حسین لڑکی اور میرا گھر! میں نے ہچکچاہٹ کے ساتھ کہا میں تو اپنے کمرے میں اکیلا رہتا ہوں۔ اور میں کنوارہ .....

"آپ میرے یہاں ٹھہریں۔ دنیا کی نظروں میں تو یہ ٹھیک نہیں ہے۔"
"آپ کنوارے ہیں تو میں بھی تو کنواری ہوں۔"
"فلمی دنیا میں داخل ہونے سے پیشتر آپ نے اس کے بارے میں کچھ سوچا بھی ہے۔"
"سوچنا کیا ہے؟ یہ کوئی آئی۔ سی۔ ایس کا امتحان تو ہے نہیں۔"
"لیکن پھر بھی سٹڈیو کے حالات سے آپ واقف ہیں۔"
"سٹڈیو کے حالات سے مجھے کیا لینا ہے۔ میرا دل صاف ہے۔ تو میرے لئے دنیا کا دل صاف ہے۔"
"آپ کا دل صاف ہے یہ تو میں نے مان لیا۔ مگر آپ کے دل کے صاف رہنے سے سٹڈیو میں کام کرتے وقت دوسرے لوگوں کا دل تو صاف نہیں ہو جائے گا۔ خیر آپ آگئی ہیں۔ میرے عزیز دوست کا خط لائی ہیں۔ تو کل سٹڈیو کا رنگ ڈھنگ دیکھ لیجئے۔ پھر جیسا آپ کا ارادہ ہوگا۔ کہئے گا۔ آپ چاہیں گی۔ تو کام ملنے میں دقت نہ ہوگی۔ ہاں شرافت ضرور کھو بیٹھو گی۔"

اس رات کو اس نازنین کے کھانے پینے سونے وغیرہ کا سب انتظام کر میں بالائی منزل میں ایک دوست کے کمرے میں جا کر سویا۔ دوسرے دن اُسے لے کر سٹڈیو گیا۔ میرے ساتھ ایک حسین لڑکی کو دیکھ کر دروازے میں داخل ہوتے ہی نیپالی دربان نے ایک فرشی سلام بجا کر جس طرح گھور کر اس نازنین کی طرف دیکھا اس سے وہ بیچاری شرم کے مارے زمین میں گڑی جا رہی تھی۔ آگے پہنچتے ہی ایک مسلمان ایکٹر نے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ واہ! مرزا صاحب! آج آپ کے کیا کہنے ہیں۔ اور ذرا آگے بڑھنے پر دو اینگلو انڈین لڑکیوں نے انگریزی میں جو ریمارک کیا۔ اسے سنکر وہ نازنین پانی پانی ہوگئی۔

۱۰-۵ منٹ سٹڈیو میں رہ کر اس نے وہاں کے جو حالات دیکھے اُن سے وہ

اتنی گھبرا گئی۔ کہ اس نے اسی دن گھر لوٹ جانے کا ارادہ کر لیا میں اُسے سٹیشن پر پہنچانے گیا میں نے کہا کسی طرح اپنے ماں باپ کو سمجھا بجھا کر آگے پڑھنے کے لئے راضی کر لو۔

مقررہ وقت پر گارڈ نے سیٹی بجائی۔ اس نے مسکراتے ہوئے مجھے سلام کیا۔ دیکھتے دیکھتے گاڑی سٹیشن کے پار ہو گئی۔ میں بت بنا ہوا سٹیشن پر کھڑا ہو کر سوچتا رہا کہ لڑکیوں میں ایکٹرس بننے کی خواہش اتنی زبردست کیوں ہو رہی ہے۔ ان کے لئے کیا روزی کمانے کا اور کوئی طریقہ نہیں رہ گیا ہے۔ وہ اگر چاہیں تو کسی اچھے پیشے کو اختیار کر سکتی ہیں۔ کیوں نہیں کلرک بننے کی کوشش کرتیں۔ کیوں نہیں کسی اچھے سکول کی ہیڈ مسٹرس بن جاتیں سٹڈیو کے حالات جتنے خراب ہیں انہیں دیکھ کر کسی شریف گھرانے کی لڑکی کا داخل ہونا میری رائے میں ٹھیک نہیں کسی نازنین کا سڈول جسم خواہ کیسا ہی ہو۔ اس کی مسکراہٹ کتنی ہی سرس کیوں نہ ہو۔ مگر سٹڈیو کی دھدھکتی ہوئی آگ اس کی تمام کششوں کو جلا کر خاک کر دے گی۔ کچھ دنوں کے بعد اسے اپنی عصمت بچانا محال ہو جائیگا۔ اسے اپنی زندگی بھٹکتی ہوئی چڑیا کی طرح بسر کرنے کی عادت پڑ جائیگی۔ آج اس شاخ پر اور کل اس شاخ پہ اپنا رہن بسیرا کرنا اس کے لئے ایک معمولی بات ہو جائیگی۔ ایکٹرس بننے کی خواہش رکھنے والی لڑکیوں کو ایک دو بار نہیں سینکڑوں بار اس سوال پر غور کرنا چاہیئے۔

میں نے کہا۔ لیکن آپ تو دیکھ ہی رہے ہیں کہ اس تھیٹریکل کمپنی میں بھی میں کس طرح کام کر رہی ہوں۔

——— وہ میں آپ کے اوپر کسی طرح کا شک نہیں کرتا۔ میں نے اصلیت آپکے سامنے رکھدی ہے یوں اگر آپ فلم کمپنی میں جانا چاہیں گی تو میں اپنے یہاں ہی آپ کو ملازمت دلانے کی کوشش کروں گا۔"

یہ کہہ کر وہ رخصت ہوئے۔

حسن کے دل دادوں کا مجمع

دیارام چاچا ہی ایک ایسے شخص تھے جن سے میں ہر ایک کام میں صلاح لیا کرتی تھی۔ اس دن جب نواب صاحب نے ٹیلیفون کیا تھا۔ ان کے بارے میں میں کافی سن چکی تھی [illegible] کام کرنے والی عورتوں سے میل ملاقات کی خواہش رکھنے والوں کی تعداد بہت ہوا کرتی ہے مگر میرے یہاں آنے والوں کی تعداد بہت کم تھی۔ کیونکہ میں کسی سے میل ملاقات بڑھانا نہیں چاہتی تھی۔ میل ملاقات سے خرچ بڑھانے کا اندیشہ تھا۔ مگر میں کفایت سے چل رہی تھی۔ کیونکہ ونود کا مستقبل میری آنکھوں کے سامنے تھا۔ میں جس چیز کی خاص ضرورت سمجھتی تھی وہی گھر میں آتی تھی۔ ٹیلیفون گھر میں تھا۔ مگر میں مہینے میں دو چار مرتبہ سے زیادہ اس کا استعمال نہ کرتی تھی۔

کلکتہ میں رہتے ہوئے مجھے کافی عرصہ ہو چکا تھا۔ مگر گھر کی یاد اب بھی میرے دل میں تازہ تھی ماں باپ اور بہن بھائیوں سے ملنے کے لئے دل کبھی کبھی بے چین ہو جاتا دیارام چاچا درحقیقت دیا کے اوتار کے روپ میں میرے ساتھ تھے۔ بالمیک کی مانند وہ بھی اپنی اس بدقسمت بیٹی کو زیادہ سے زیادہ مذہبی خیال کے بنانے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں نے جب نواب صاحب کے یہاں چائے کی دعوت پر جانے کی بات کہی تو وہ آگ ببوکا ہو گئے۔ انہوں نے ایسے غصہ کے ساتھ میری طرف دیکھا جیسے گھایل ہرن شکاری کی طرف دیکھتا ہے۔ کافی دیر تک سنجیدہ رہنے کے بعد وہ بولے دیکھ بیٹی یوں تو تو سمجھدار ہے۔ تعلیم یافتہ ہے۔ مگر میں ان پیسے والوں سے میل ملاقات

بڑھانے کے حق میں نہیں ہوں۔ ان کے پاس پیسہ ہوتا ہے۔ دل نہیں یہ پیسہ دیکر ہم غریبوں کو خرید لینا چاہتے ہیں۔ ان سے واقفیت بڑھانا تمہارے لئے نقصان دہ ہے۔ کیا مہیپ کمار سے واقفیت بڑھانے کا نتیجہ تمہاری آنکھوں کے سامنے نہیں ہے۔

یہ کہہ کر انہوں نے میرے چہرے پر نظر ڈالی۔ میری آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ اپنا سونے کا گھر چڑیوں کی طرح پھدک پھدک کر کھیلتے ہوئے بھائی بہن آنکھوں کے سامنے آ گئے۔ دیارام چاچا نے پھر کہا بیٹی جو کچھ ہونا تھا وہ تو ہو گیا۔ لیکن اب آگے قدم نہ بڑھاؤ۔ کوئی راجہ ہو خواہ نواب ہم کسی کی دولت کے بھوکے نہیں ہیں۔ ہم ایشور کے کرم سے جس حالت میں پہنچے ہیں اُسی میں سکھی ہیں۔

دیارام چاچا سے بات کرنے کے بعد نواب صاحب سے ملنے کی خواہش بالکل جاتی رہی۔ میں سوچنے لگی۔ کہ درحقیقت مجھے کسی بھی آدمی سے میل ملاقات بڑھانے کی ضرورت کیا ہے؟ میں تھیٹر میں کام کرتی ہوں۔ اگر میرا پارٹ لوگوں کو پسند آتا ہے تو اس کے لئے وہ میرے پارٹ کی تعریف کر سکتے ہیں۔ مگر میرے ساتھ بات چیت کر کے مجھ سے تعلق بڑھانے کی کیا ضرورت ہے؟ مجھے گرینڈ ہوٹل میں چائے پلانے سے کیا مطلب؟ ضرور ہی یہ کام مجھے اپنے جال میں پھنسانے کے لئے کیا جا رہا ہے۔ اسی طرح کے خیالات میں میں غلطاں بیٹھی تھی۔ کہ نوکر نے ایک کارڈ لا کر دیا۔ وہ خط سینما اخبار کے ایڈیٹر کا تھا۔ جو انٹرویو لینے کے لئے آئے تھے۔ نوکر سے معلوم ہوا ان کے ساتھ دو اشخاص اور بھی ہیں۔ میں نے اکیلے ایڈیٹر صاحب کو اندر آنے کی اجازت دی نوکر نے ایڈیٹر صاحب کے اندر بلا کر کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ ایڈیٹر صاحب نے کہا۔ میرے ساتھ میرے ایک اسسٹنٹ ایڈیٹر

اور ایک دوست ہیں۔ انہیں بھی اندر آنے کی اجازت دیجئے۔ میں آپ کا دس منٹ سے زیادہ وقت نہ لوں گا۔

میں کیا جواب دیتی! نوکر کو انہیں بھی بلانے کا حکم دینا ہی پڑا۔ جب سب لوگ اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے تو کافی دیر تک کمرے میں سناٹا رہا۔ کوئی کچھ بولتا ہی نہ تھا۔ آخر کار ایڈیٹر صاحب نے کہا "میں چاہتا ہوں کہ آپ کے نام کی شہرت کلکتہ میں ہی نہیں بلکہ ہندوستان بھر میں پھیلجائے۔ میں اپنے اخبار میں آپ کا انٹرویو اور حال میں ہی کھینچا ہوا آپ کا ایک فوٹو شائع کرنا چاہتا ہوں۔ چند سوالات کر میں کچھ باتیں جاننا چاہوں گا۔ امید ہے آپ اس تکلیف کے لئے مجھے معاف فرمائینگی۔

ہاں ہاں آپ پوچھیے۔ میں جہاں تک ممکن ہوگا۔ آپکے سوالوں کا جواب دینے کی کوشش کرونگی۔ مگر سوال کرنے سے پہلے میں آپ کو بتلا دینا چاہتی ہوں۔ کہ آپ میرے پارٹ ادا کرنے کے ہنر اور ناچ میں کمالیت نیز میری علم ادب سے انس کے سوا اور کسی مضمون پر سوال نہ کریں ورنہ میں آپ کے کسی سوال کا بھی جواب دینے سے انکار کر دونگی"۔

ایڈیٹر صاحب حیران سے رہ گئے۔ وہ کچھ سوالوں کی فہرست بنا کر لائے تھے۔ وہ انہوں نے میرے سامنے رکھ دی۔ اس میں جو سوال تھے وہ یہی تھے۔ آپ کہاں پیدا ہوئیں۔ آپ کی تعلیم کہاں تک ہے۔ تھیٹریکل کمپنی میں کیسے داخل ہوئیں۔ مستقبل کے متعلق آپ کا کیا ارادہ ہے۔ مگر ان فضول سوالوں کا جواب دینے سے میں نے انکار کر دیا۔

اب اُن تینوں اشخاص کی پریشانی دیکھنے کے قابل تھی۔ ایڈیٹر صاحب کے ہمراہ ان کا جو اسسٹنٹ تھا۔ وہ کچھ سمجھدار اور واقف کار جان پڑتا تھا۔ ان کے ساتھ تیسرے شخص تھے۔ وہ امیرانہ ٹھاٹھ باٹھ میں تھے۔ ان کے نفیس لباس زیب تن تھا اور

وہ بار بار اپنی جیب سے ریشمی رومال نکالکر اپنا منہ پونچھ رہے تھے۔ ان کے کپڑوں سے کافی خوشبو آرہی تھی۔ جس سے جان پڑتا تھا۔ کہ وہ مجھ سے ملنے کے لئے پوری تیاری کرکے آئے تھے۔

ایڈیٹر صاحب کے اسسٹنٹ نے پھر خموشی توڑتے ہوئے کہا "کیا فلمی دنیا کی طرح تھیٹریکل دنیا بھی شریف گھرانے کی خاتون کے لئے خطرے سے خالی ہے۔

——— میرا اس بارے میں کوئی خاص تجربہ نہیں ہے۔ میں تو تھیٹر شروع ہونے سے دس پندرہ منٹ پہلے تماشہ گاہ میں پہنچ جاتی ہوں اور تماشہ کے ختم ہوتے ہی چلی آتی ہوں۔ ری ہرسل میں میں کبھی آتی جاتی نہیں اس لئے مجھے تھیٹر کے حالات سے خاص واقفیت نہیں ہے لیکن جس قسم کے لوگوں کی کافی تعداد اس لائن میں ہے اس شریف گھرانے کی لڑکیوں کا کام کرنا مشکل ہے"

ایڈیٹر صاحب کے اسسٹنٹ نے کچھ حیرانی کے ساتھ میری باتیں سنیں کچھ دیر تک خاموش رہنے کے بعد اس نوجوان نے کہا "اگر آپ برا نہ مانیں تو ایک سوال کروں"

ہاں ہاں دریافت کیجئے میں نے کہا

"آج کل کے نوجوانوں میں محبت کی جگہ نفس پرستی زیادہ زور پکڑتی جاتی ہے میرا خیال ہے کہ اس میں تھیٹر اور سینما نے آگ پر تیل کا کام کیا ہے۔

ہندوستانی نوجوانوں میں نفس پرستی کے خیال دن بدن بڑھ رہے ہیں خوبصورتی سے محبت کرنا برا نہیں۔ مگر ہنر اور حسن پرستی کے نام پر نفس پرستی کو جگہ دینا بالکل قابل ملامت ہے۔ مگر آج ہم دیکھتے ہیں۔ کہ زیادہ تر سکول اور کالجوں کے طلباکی موت کے بعد اگر ان کے مکانوں کی تلاشی لی جائے تو کسی شاعر کا یہ مقولہ صرف بحرف

صبح نکلیگا۔ ے

"چند تصویر بتاں۔ چند حسینوں کے خطوط "
" بعد مرنے کے میرے گھر سے یہ ساماں نکلا "

اخبارات میں زیادہ تر اس طرح کی خبریں پڑھنے کو ملتی ہیں۔ کہ فلاں لڑکی کا فلاں لڑکے سے رشتۂ قائم ہو گیا تھا۔ دونوں میں خوب خط وکتابت ہوتی رہی۔ ایک دن لڑکی کے باپ کے ہاتھ ایک خط لگ گیا۔ باپ نے لڑکی کو بہت بھلا بُرا کہا۔ لعنت ملامت کی۔ اور اس کے عاشق لڑکے کو مستقبل میں خط نہ لکھنے کی تاکید کی۔ اس کے بعد لڑکے یا لڑکی کی خودکشی کی خبر اخبارات میں شائع ہوتی ہے۔ یا دونو کے کسی نامعلوم مقام پر بھاگ جانے کی خبر ملتی ہے۔ اس طرح کے بیشمار واقعات آئے دن ہوتے رہتے ہیں

ہم جانتے ہیں کہ سن بلوغت اور عالم شباب کے باہمی میل کے زمانے میں دل میں کچھ نئے خیال پیدا ہوتے ہیں حسن پرستی کا جذبہ زور پکڑ جاتا ہے۔ زمانہ حال میں بائیرن اور شیکسپیر کے شاعرانہ خیالات کا لگاتار مطالعہ کرنے والے کالج کے نوجوان فوراً کسی خیالی دنیا میں بودوباش رکھنے والی نازنین کو تصور میں لے آتے ہیں۔ ان کا یہ تصور اتنا زبردست ہوتا ہے۔ کہ وہ خواب میں بھی یہ سوچ نہیں سکتے کہ شاعر کے تصور کردہ خیالی دنیا کی نازنین اس فانی دنیا میں پیدا نہیں ہو سکتی۔ میں ایسے کئی بدقسمت نوجوانوں کو جانتا ہوں جو حسن پرستی کے پیچھے پاگل ہو گئے ہیں۔ جن کی زندگی کا آدھے سے بھی زیادہ حصہ حسینوں کی تعریف کرنے اور انہیں خط لکھنے میں گذر جاتا ہے۔ وہ آج اس نازنین کو عشقیہ خطوط لکھیں گے۔ یا کل کسی اور کو۔ آج مس پروانہ کی تعریف کریں گے۔ تو کل مس کی تعریف کے پُل باندھ دیں گے۔

مغربی تعلیم کے دلدادوں نے ہمارے ملک کے نوجوانوں کے دماغ کو اتنا

پراگندہ کردیا ہے کہ وہ محبت محبت چلاتے تو ہیں۔ مگر محبت کیا ہے یہ سمجھنے کی کبھی کوشش نہیں کرتے۔ محبت ایک پاکیزہ رشتہ ہے۔ اس میں نفس پرستی کے لئے کوئی جگہ نہ ہونی چاہیئے۔

محبت اور نوجوان سوسائٹی یہ ایک ایسا مضمون ہے جس پر کسی نوجوان نازنین سے بحث مباحثہ کرنا تہذیب کے خلاف ہے۔ مگر ایڈیٹر صاحب کے وہ اسسٹنٹ دنیاداری سے دور رہنے والے انسان دکھائی پڑے۔ پہلی بار کی ملاقات میں کوئی شخص اس طرح کے سوالات نہیں کر سکتا۔ مگر وہ باہمت نوجوان ایک سانس میں ہی اپنے خیالات ظاہر کر گیا۔ اس کے اس بھولے پن پر میں مسکرائی میں نے کہا۔ آپ درست کہہ رہے ہیں۔ محبت میں نفس پرستی کے لئے جگہ نہ ہونی چاہیئے۔ مگر نوجوان لڑکے اور لڑکیاں اسے سمجھ کر بھی نہیں سمجھتیں۔

ے " بن پیئے نشہ ہو جس میں جوانی وہ ہے "

مندرجہ بالا شعر ایڈیٹر صاحب کے رفیق نے کہہ سنایا۔ اس کے اس ایک قول سے ہی میں سمجھ گئی کہ حضرت اردو کی عاشق معشوقی کی غزلیں یاد کرادیوں کے دوست بنکر اسی طرح ایکٹرسوں کی زیارت کا فخر حاصل کر لیا کرتے ہیں۔ ان کے ایڈیٹر صاحب کا اسسٹنٹ کافی لائق شخص تھا۔ ہندی اور بنگلہ تھیٹروں کے بارے میں اس سے کافی دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ اس نے بتلایا کہ کس طرح دانی بابو مرحوم چانکیہ کا پارٹ کیا کرتے تھے۔ ہندی سٹیج پر جب گوہر سیتا کا پارٹ کرتی تھی تب کلکتہ بھر میں دھوم مچ جاتی تھی۔ وغیرہ وغیرہ۔

کافی دیر تک بات چیت کرنے کے بعد وہ لوگ اٹھ کھڑے ہوئے اسسٹنٹ ایڈیٹر صاحب نے تکلیف اور سمع خراشی کے لئے معافی طلب کی اور رخصت ہوئے

وقت اپنی تصنیف کردہ ایک کتاب مجھے نذر کی میں نے سب کو تعظیم سے مصافحہ کر رخصت کیا۔ یہ لوگ نیچے اترے۔ سیڑھیوں سے اترتے ہوئے۔ ایڈیٹر صاحب کے تیسرے رفیق نے کہا۔ اس کی مسکراہٹ میں تو جادو ہے۔ بھائی موتی بکھیرتی ہے۔ میں اس نفس پرست نوجوان کے اس ریمارک کو سُنکر جھلّا اٹھی۔ میں نے زور سے دروازہ بند کر لیا۔ اور ایک صوفے پر جا کر گر پڑی۔

"نوابی چکر"

——— وہ ملنے کے لئے آئے ہیں"

——— "کہہ دے کہ میں گھر میں نہیں ہوں"

——— "مگر میں تو ان سے آپ کی گھر میں موجودگی کی بات کہہ چکا ہوں سرکار!"

——— "تو گدھا ہے۔ تجھے میرے پوچھے ہر کسی سے میری گھر میں موجودگی کی بات کیوں کہہ دیتا ہے۔ جانتا نہیں کہ یہاں بدمعاش شخصے خواہ مخواہ وقت برباد کرنے کے لئے آتے ہیں۔

——— "وہ تو بڑے شریف آدمی جان پڑتے ہیں سرکار! صبح دو بار آئے تھے۔ مگر میں نے ٹال دیا۔ اب کس طرح ٹالوں۔ اسطرح ہر مرتبہ جھوٹ بولنا بھی تو ٹھیک نہیں ہے۔

——— "کہہ دے کہ میری طبیعت علیل ہے۔ آج میں کسی سے نہیں مل سکتی"

——— "اچھا"

——— "اور دیکھ ساتھ میں کون ہے!"

——— "کوئی بھی نہیں ہے۔ موٹر کا ڈرائیور ہے۔ اور وہ ہیں۔ آپ دیکھ نہ لیجئے چھجے سے۔

مجھ میں اور نوکر میں مندرجہ بالا باتیں ہوئیں۔ میں نواب صاحب سے اس دن گرینڈ ہوٹل میں ملنے والی تھی۔ مگر دیا رام چاہے میری جو باتیں ہوئیں

ان سے میں اس نتیجہ پر پہنچی۔ کہ راجوں اور نوابوں کی دنیا عیش و آرام کی دنیا ہے۔ وہاں محبت اور وہ بھی دلی اس نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ یہی وجہ تھی۔ کہ میں بہت کم لوگوں سے ملتی تھی۔ اپنے کام سے کام! نوکروں کو بھی میں نے یہ ہدایت دے رکھی تھی کہ جو کوئی بھی مجھ سے ملنا چاہے وہ پہلے وقت مقرر کئے بغیر مجھ سے ملاقات نہیں کر سکتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا تھا۔ کہ مجھ سے ملاقات کرنے والوں کی تعداد بہت کم ہو گئی تھی۔

کلکتہ کی زندگی ہی ایسی ہے کہ یہاں پر آکر آدمی کافی چالاک ہو جاتا ہے۔ یہ لوگ اپنی اپنی غرض پوری کرنے میں اتنے مصروف رہتے ہیں کہ کسی کو کسی دوسرے شخص کے رنج و راحت کی چنداں فکر نہیں رہتی۔ اکثر دیکھا یہ جاتا ہے۔ کہ ایک ہی مکان میں بود و باش رکھنے والے دو اشخاص ایک دوسرے کو بھی نہیں پہچانتے ان کے لئے ان کا اپنا کمرہ ہی وسیع دنیا ہے۔ کلکتہ کی زندگی نے مجھے بھی کافی چالاک بنا دیا تھا۔ میں سمجھ گئی تھی۔ کہ جس چیز کی جتنی بے قدری کی جائے وہ اتنی ہی زیادہ اپنی طرف کھچی ہوئی چلی آتی ہے۔

دیارام چاچا کے منع کر دینے کی وجہ سے میں اس دن نواب صاحب سے ملاقات کرنے کے لئے گرینڈ ہوٹل نہیں گئی تھی۔ انہوں نے کئی بار ٹیلیفون بھی کیا۔ مگر میں نے باہر چلے جانے کا بہانہ کر انہیں ٹال دیا۔ میں نے جتنا انہیں ٹالا وہ اتنے ہی زیادہ میری طرف کھچے ہوئے چلے آئے۔ اس دوران میں نے ان کے بارے میں جو واقفیت حاصل کی اس سے میں اس نتیجہ پر پہنچی کہ اس آدمی سے جتنا ہی دور رہوں اتنا ہی اچھا ——— نواب صاحب شوقین طبیعت کے آدمی تھے۔ ان کے پاس ۱۵-۲۰ لاکھ روپیہ سالانہ کی آمدنی کی ریاست تھی۔ اور وہ اس کے اکیلے مالک تھے۔ جو کچھ سیاہ سفید کرتے کوئی اس میں چون و چرا کرنے والا نہیں تھا۔ خوب عیش و آرام کی زندگی بسر کرتے تھے آج

یہاں تو کل وہاں۔ آج ہیرا کے گلے کا ہار بنتے ہیں تو کل کسی شیاما کا دروازہ کھٹکھٹا رہے ہیں۔

میں جس تھیٹر میں کام کرتی تھی۔ اسی تھیٹر کی ایک ایکٹرس آن حضرت کے پاس پانچ چھ مہینے رہ آئی تھی۔ اس نے مجھے بتلایا کہ نواب صاحب کے محبت کرنے کا ڈھنگ عجیب ہے۔ وہ پہلے تو ایسی محبت دکھلاتے ہیں کہ جان پڑتا ہے کہ اب دنیا میں ان کے لئے کوئی اور ہے ہی نہیں۔ روزانہ نئے نئے زیور بنتے ہیں۔ کپڑے خرید کر منگائے جاتے ہیں۔ گانا بجانا ہوتا ہے۔ پھر کسی بھی دن سب کپڑے اور زیور چھین کر محل کے باہر کر دیا جاتا ہے۔ اتنا پیسہ بھی گانٹھ میں نہیں رہنے دیا جاتا۔ کہ ریل کا ٹکٹ خرید کر کہیں جایا بھی جا سکے۔ اس ایکٹرس نے مجھے یہ بھی بتلایا کہ نواب صاحب عجب شکی مزاج ہیں جو کوئی بات کہہ دی جاتی ہے۔ اس کو مان لیتے ہیں کہتے ہیں ایک مرتبہ ایک آدمی نے صلاح دی کہ بھینس رکھنے میں کافی منافع ہے۔ تو آپ نے سو بھینسیں خرید لیں۔ مگر ان کا دودھ فروخت کرنے کے لئے آپ نے اتنے سخت اصول بنائے کہ لوگ ان کو منظور نہ کر سکے۔ جب چار پانچ مہینے تک ان بھینسوں کا دودھ ضائع ہوتا رہا۔ تو آپ نے اپنے مصاحبوں کو ایک ایک بھینس نذر کر دی۔

نواب صاحب کو تھیٹر کل کمپنیوں سے خاص انس ہے۔ اس ایکٹرس نے بتلایا کہ نواب صاحب نے اپنے یہاں ایک بہت بڑا تھیٹر ہال بھی بنوایا ہے۔ جس میں آپ ڈرامہ کھیلا کرتے ہیں۔ اچھی اچھی ایکٹرسوں کو کافی پیسہ دیکر نواب صاحب باہر سے لاتے ہیں۔ اور ڈرامہ میں خود ہیرو کا پارٹ ادا کرتے ہیں۔ شراب نوشی کا مرض تو انہیں اتنا زیادہ ہے۔ کہ دن رات شراب کے دور چلتے رہتے ہیں۔

میں ایکٹرس بن کر گئی تھی۔ مگر میرا ایسا تنزل نہیں ہوا تھا۔ کہ اس قسم کی افنگوں کے ساتھ میل ملاقات بڑھاؤں۔ میں جانتی ہوں۔ کہ اس کے پاس دولت ہے اور دولت انسان کو تنزل کی طرف لے جاتی ہے۔ میں نے دیارام چاچا کی بات کو گانٹھ باندھ لیا تھا اور پختہ ارادہ کر لیا تھا۔ کہ نواب صاحب خواہ کیسی بھی سازشیں کریں۔ مگر میں اپنے آپکو ان کے اس مایا جال سے بچاؤں گی۔

سیٹھ لکشمی نرائن کچھ کم دل پھینک طبیعت کے آدمی نہ تھے۔ مگر ان کے اوپر میرا استاد بد یہ تھا۔ کہ دیوی جی دیوی جی کہتے نہ تھکتے تھے۔ دیگر ایکٹرسیں انہیں ایسا جھک کر جب سلام بجا لاتیں۔ تو وہ خوش ہو جاتے مگر میرا ان کا جب آمنا سامنا ہو جاتا تھا۔ تو وہ بس یہی کہتے تھے "خیریت سے تو ہیں" کوئی تکلیف تو نہیں سیٹھ صاحب کے سلوک سے میں خوش تھی۔ مگر نواب صاحب کی بُری نگاہ کے باعث مجھے بے چینی معلوم ہوتی تھی۔ سیٹھ لکشمی نرائن کے ساتھ جب ایک دن میں نے سٹیج کے سامنے میوزک چیزوں کے پاس انہیں بیٹھے دیکھا تو میرا ماتھا ٹھنکا۔ کہ کہ ہونہ ہو اب مجھے پھنسانے کے لئے نیا جال تیار کیا جا رہا ہے مجھے ملازمت کی فکر اس لئے نہ تھی کہ سینما کا پارٹ میری مانند اور کوئی ایکٹرس کر نہیں سکتی تھی۔ اس لئے اگر سیٹھ صاحب کو کمپنی جاری رکھنی ہو تو خواہ مخواہ انہیں مجھے ملازم رکھنا ہی پڑے گا ادھر میں اپنے پرانے واقف کار اور دیرینہ دوست مرزا صاحب پر اس بات کے لئے زور ڈال رہی تھی۔ کہ وہ مجھے اپنی فلم کمپنی میں کوئی جگہ دلوا دیں۔ مرزا صاحب اکثر میرے یہاں آیا جایا کرتے تھے۔ وہ مجھے بتلایا کرتے کہ کس طرح ڈائرکٹر ایکٹرسوں کو اپنے ہاتھ کی کٹھ پتلی بنائے رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کس طرح ایکٹرسیں ڈائرکٹروں کے سایہ سے دور بھاگنے کی کوشش کرتی ہیں۔ اور کس طرح ڈائرکٹر صاحبان ان کے پیچھے شیطان

کی طرح پڑھ جاتے ہیں۔ ایک مرتبہ انہوں نے بتلایا کہ ایک ایکٹرس میک آپ روم میں اپنے فیشن کا میک آپ کر رہی تھی۔ اسی دوران میں اس نے سُنا ڈائرکٹر صاحب آ گئے۔ بیچاری سکپکا گئی۔ مگر کرتی کیا؟ اگرچہ وہ ڈائرکٹر صاحب اس فلم کمپنی میں کام نہیں کرتے تھے مگر پھر بھی نہ جانے کیوں وہ ایکٹرس اُنسے خوف کھاتی تھی۔ مرزا صاحب بتلا رہے تھے کہ جب انہوں نے اس خوف کی وجہ پوچھی تو اس ایکٹرس نے یہی کہا کہ ڈائرکٹر صاحب پبلک مین ہیں۔ تمام سبھا سوسائٹی والے انہیں ہمیشہ چندے کے لئے گھیرے رہتے ہیں۔ میں جب کبھی ان کے آنے کی بات سنتی ہوں تو مجھے خوف ہونے لگتا ہے کہ کہیں وہ چندے کے لئے نہ آئے ہوں اس کے اس قول میں سچائی کا کتنا حصّہ تھا۔ میں کہہ نہیں سکتی۔

مرزا صاحب کے ساتھ میں کئی بار سٹڈیو میں جا کر شوٹنگ دیکھ آئی تھی۔ کئی فلم ستاروں سے واقفیت حاصل کر چکی تھی۔ دو ایک ڈائرکٹروں سے بھی معمولی دعا سلام ہو گئی تھی۔ ان لوگوں سے ملکر مجھے اس بات کا پتہ تو چل گیا کہ اور کچھ ہو نہ ہو مگر وہ لوگ بملا کے نام سے مجھے بخوبی جان گئے تھے۔ میں بھی دل ہی دل میں خوش تھی کہ اور کچھ ہو نہ ہو مگر سیٹھ لکشمی نرائن کی تھیٹریکل کمپنی نے کلکتہ کی پبلک کے سامنے میرا نام لکھدیا اچھی بات تو یہ تھی کہ میں جلاوطن سیتا کا احساس کرتی تھی۔ یہی باعث تھا کہ میرے پارٹ میں زندگی آجاتی تھی۔ پارٹ ادا کرتے وقت میری آنکھوں میں آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی تھی۔ جس کسی نے میرے پارٹ کی تعریف سنی وہی تھیٹر دیکھنے گیا اور میرے لئے اپنے دل میں عزت اور ہمدردی لے کر گھر واپس آیا۔ فلمی دنیا کے زیادہ تر لوگ مجھے جان گئے تھے۔ ہاں تو اس دن ملازم کے کہنے سے میں نے برآمدے میں کھڑی ہو کر نیچے کی جانب جھانکا۔ مگر گاڑی میں کوئی دکھائی نہ دیا میں آکر پھر اپنی کرسی پر بیٹھ گئی۔ مجھے بیٹھے ہوئے مشکل سے دس منٹ ہوئے

ہوں گے کہ نوکر کو دھکا دیکر وہ تین آدمیوں کو میں نے اندر داخل ہوتے دیکھا۔ میں ڈر گئی۔ لیکن میں نے ان لوگوں کی اس بدتہذیبی کی طرف توجہ نہ دیکر انہیں دونوں ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا اور کہا" آیئے تشریف رکھیئے"

ان میں ایک صاحب تو وہی نواب صاحب تھے۔ اور دو دیگر اشخاص شاید ان کے مصاحب تھے۔ نواب صاحب نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ جناب معاف کیجیئے اس گستاخی کے لیئے۔ آپ نے نوکر کیا رکھے ہیں۔ کتے پال رکھے ہیں۔ انسان کو پہچاننے کی بھی ان لوگوں کو تمیز نہیں"

"جی ہاں۔ جی ہاں یہی تو میں کہتا ہوں۔ کہ حضور پُرنور کسی کے گھر کو رونق افروز کریں اور مالک مکان کے ملازم حضور والا کے ساتھ گستاخی سے پیش آئیں اس سے بڑی حماقت اور کیا ہو سکتی ہے؟ ایک مصاحب نے فرمایا۔

دوسرے صاحب بھی چوکنے والے نہ تھے۔ وہ کہنے لگے" یہ تو غنیمت ہوئی۔ کہ سرکار کو غصہ نہیں آیا ورنہ نہ جانے کیا ہو جاتا۔ پہلوان صاحب ساتھ نہیں تھے ورنہ قسم خدا کی بغیر مارے نہ چھوڑتے۔ ادنےٰ غلام کی یہ جرأت کہ حضور پُرنور کو اندر آنے سے روکے"

میں ان خوشامدیوں کی باتیں سنکر دل ہی دل میں مُسکرا رہی تھی۔ نواب صاحب پر ان لوگوں کی اس چاپلوسی کا اثر پڑ رہا تھا۔ ان کے منہ سے شراب کی بُو آ رہی تھی۔ وہ پھر فرمانے لگے" اسی وجہ سے تو ہم ہر وقت پہلوان کو ساتھ نہیں رکھتے بے ڈھب آدمی ہے۔ ذرا بھی کسی نے سخت بات کہی تو اس سے برداشت نہیں ہوتی۔ دیکھا نہیں تھا۔ اس سال لکھنؤ کی نمائیش میں اس نے ذرا سی بات پر سات آٹھ اشخاص کو پیٹ ڈالا تھا۔ ہاں یہ خیر گذری کہ آج وہ ہمارے ہمراہ نہیں تھا۔ ورنہ میم صاحبہ کے نوکر کو گستاخی کرنے کا آج ہی مزا مل جاتا۔

بی۔ بی! میں آپ سے عرض کروں گا کہ تھیٹریکل کمپنی میں کام کرنے پر بھی اگر آپ کے یہاں ایسے نوکر رہیں گے تو آپ کچھ کما نہیں سکیں گی۔ دنیا میں ملنساری بڑی چیز ہے۔ اور پھر ہمارے نوابصاحب جیسے دریا دل آدمی! قسم خدا کی وہ طبیعت پائی ہے کہ جس پر خوش ہو جائیں اُسے نہال کر دیں" پہلے مصاحب نے فرمایا۔

میں ان اشخاص سے پیچھا چھڑانا چاہتی تھی۔ مگر میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کس طرح ان کو باہر نکالا جائے۔ تینوں شراب کے نشے میں چور تھے۔ اور جو دل میں آتا تھا۔ بک رہے تھے۔ وہ پھر بولے "بی بی! تمہارا جتنا مزاج بڑھ گیا ہے اتنا بڑھا ہوا مزاج میں نے کلکتہ میں کسی کا نہیں دیکھا۔ اس دن تم نے کہا تھا کہ میں ہوٹل میں چائے پینے کے لئے ضرور آؤں گی۔ میں نے انتظام کیا۔ مگر جناب تشریف نہ لائیں کئی مرتبہ ٹیلیفون پر بات کرنے کی کوشش کی مگر جناب نے تو تشریف رکھتے ہوئے بھی انکار کر دیا۔ میں جناب کی وجہ سے نہایت پریشان ہوا ہوں۔ آپ کا خیال ہے کہ میرے ساتھ ربط ضبط بڑھانے سے سیٹھ لکھشمی نارائن ناراض ہو جائیں گے۔ مگر تم اس بات کی فکر نہ کرو۔ وہ بھی میرے دوست ہیں۔ اور ایسے دوست کہ دیکھنے والے رشک کریں اب ہملوگ ساتھ ہی ساتھ کھاتے پیتے ہیں۔ اور ساتھ ہی سیر سپاٹا کرتے ہیں۔ ہم میں اب پردہ نہیں ہے۔ تم ان کی فکر نہ کرو۔ ہم سب ٹھیک کر لیں گے۔ کیوں میاں جلیل!" نواب صاحب نے فرمایا۔

جلیل میاں نے ہاں حضور کرتے ہوئے کہا۔ "بجا فرمارہے ہیں غریب پرور" مجھے نواب صاحب کی بیہودگی پر غصہ آرہا تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا۔ کہ میں سیٹھ لکھشمی نارائن کے خوف سے اس سے میل ملاقات نہیں بڑھا رہی ہوں مگر

اس کو کیا پتہ تھا۔ کہ اپنی دولت سے انجان لڑکیوں کی زندگی برباد کرنے والے دولتمندوں کی نسبت میرے لیں کیسے بغاوت کے خیال بھرے ہوئے ہیں۔ دولتمند باپ کے بیٹے ہیپی نے میرے عیش و نشاط کی دنیا کو کس طرح برباد کر دیا تھا۔ اس بات کو میں ابھی بھولی نہ تھی اور بھول بھی نہیں سکتی تھی۔ ان لوگوں کی باتیں میں اور زیادہ سننے کے لئے تیار نہ تھی۔ میں اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اور میں نے کہا آپ لوگ معاف فرمائیں! میرے بچے کی طبیعت علیل ہے۔ میں زیادہ وقت تک آپ لوگوں کے پاس بیٹھ نہیں سکتی۔"

"آہا ہا! یہ مزاج" جلیل نے کہا۔ ؎

"خدا جب حسن دیتا ہے نزاکت آ ہی جاتی ہے"

میرا غصہ بڑھ گیا۔ میں نے انہیں ڈانٹتے ہوئے کہا۔ آپ لوگ سیدھی طرح یہاں سے جائیں گے یا میں پولیس کو فون کروں۔ یہ میرا گھر ہے سرائے یا ہوٹل نہیں" یہ کہہ کر میں نے فون کیا۔ میرے "ہیلو" کہتے ہی تینوں اصحاب اٹھ کر چلے گئے۔ میں نے فون پھر رکھ دیا۔ وہ لوگ نہ جانے کیا بکتے جھکتے چلے گئے۔

ان لوگوں کے چلے جانے کے بعد میں نے اپنا تمام غصہ نیپالی دربان پر ہی نکال دیا۔ میں نے اس سے کہا۔ تمہارے جیسے بیوقوف نوکر کے رکھنے سے کیا فائدہ؟ جس کے جی میں آیا وہ دھڑ دھڑاتا اوپر چلا آیا۔ اگر اسی طرح جو چاہے چلا آئے تو پھر مجھے ملازم رکھنے کی ہی ضرورت کیا ہے؟ ڈھائی سیر کھانا اور ڈھائی گھنٹے دو گھنٹے بھی طریقہ کی ڈیوٹی نہیں دے سکتا تو نوکری کیوں نہیں چھوڑ دیتا۔ کلکتہ میں آدمیوں کی کمی نہیں ہے کئی بار کہہ چکا کہ پہلے مجھ سے پوچھے بغیر کسی کو اندر نہ آنے دو مگر حضرت کے دماغ میں یہ بات سماتی ہی نہیں ہے۔ دیکھو آئندہ اگر اس طرح کی کوئی واردات ہوئی تو میں تمہیں اسی دن نکال دونگی۔

نوکر خاموش تھا۔ میں غصے میں بھرائی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

بچپن کی یاد

دنود میرا بیٹا تھا۔ اس کے مستقبل کے لئے مجھے اتنی فکر تھی جتنی اپنے جسم کی بھی نہیں میں جب اسے دیکھتی تو جان پڑتا جیسے میری دلی مراد انسانی شکل میں نمودار ہوئی ہے گناہ اور ثواب کے باہمی میل سے پیدا ہوا ہوا وہ بچہ دنیا کی نظر میں خواہ کچھ ہو مگر میری نگاہ میں وہ معصومیت کی زندہ تصویر تھا۔ دنیا خواہ اسے کچھ کہے میں اسے ایک اعلےٰ ہستی بنانے کی دھن میں تھی۔ اس کے لئے میں نے کوشش بھی شروع کر دی تھی۔ میں نے اس کے نام سے بنک میں الگ حساب کھول دیا تھا۔ جس میں اس کے نام سے لگاتار کچھ نہ کچھ جمع کر رہی تھی۔

کافی عرصہ گذر چکا تھا۔ مگر پھر بھی ابھی تک اپنے ماں باپ۔ بہن بھائی اور شوہر کی یاد میرے دل سے فراموش نہیں ہوئی تھی۔ دیارام چاچا کبھی کبھی اپنے گاؤں جایا کرتے تھے۔ ان کی زبانی گھر کے حالات معلوم ہو جایا کرتے تھے۔ جب میری چھوٹی ہمشیرہ رجنی کی شادی کی خبر دیارام چاچا نے مجھے سنائی تو میرا دل گھر جانے کے لئے بے تاب ہو اٹھا۔ میری خواہش ہوئی۔ کہ جاکر رجنی کی شادی میں شریک ہو جاؤں مگر یکایک خیال آیا۔ کہ میرا اس کی شادی میں شریک ہونا بیچاری رجنی کی زندگی کو بھی تباہ کر دے گا۔ لوگ کہیں گے کہ یہ اس کی چھوٹی بہن ہے جو حاملہ ہونے پر گھر سے بھاگ گئی تھی۔ اور بہت کچھ ممکن ہے کہ برات والے میرے پہنچنے کی خبر پاتے ہی گھر چھوڑ کر چلے جائیں۔ اور دلہا رجنی سے شادی کرنے سے بھی انکار کر دے۔ ان خیالات کے آتے ہی دل مسوس کر رہ گئی۔ مگر میں نے پانچسو روپیہ کا بیمہ دیارام چاچا کو دہلی بھیجکر اپنے باپ کے نام کرا دیا۔ دہلی سے روپیہ بیمہ کے ذریعہ بھیجنے کا مطلب

یہ تھا۔ کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ گھر والے یا کسی رشتہ دار کو یہ پتہ لگ جائے کہ پریا دنیا میں زندہ ہے۔ اور وہ اسی کی جستجو میں نکل پڑیں۔

دیارام چاچا نے دہلی سے واپس آ کر یہ بھی بتلایا۔ کہ گاڑی میں ان کی ملاقات ایک پروفیسر سے ہوئی تھی۔ جو اسی کالج میں پروفیسر تھا۔ جس میں میرے شوہر پروفیسر تھے ان سے بات چیت کرنے پر چاچا کو پتہ لگا کہ میرے شوہر اپنی اہلیہ کے لقمۂ اجل ہو جانے کی خبر سن کر اتنے پریشان ہو گئے تھے کہ ان کے لئے زندگی بوجھ ہو گئی ان کی والدہ اس وقت زندہ تھی۔ اس باعث انہوں نے نوکری نہیں چھوڑی مگر بیوی کے مرنے کے پانچ چھ مہینے بعد ہی انکی والدہ کا بھی انتقال ہو گیا والدہ کی موت کے بعد پروفیسر صاحب نے پروفیسری سے استعفیٰ دے دیا۔ اور تب سے ان کا پتہ نہیں ہے۔ کہ اب وہ کہاں ہیں۔

دیارام چاچا سے یہ تمام حالات سنکر میرا اپنے شوہر پر اور بھی اعتقاد بڑھ گیا۔ شوہر کی عظمت میری آنکھوں کے سامنے آ کر ناچنے لگی۔ انہوں نے اس گناہ کو جو مجھ سے سرزد ہو گیا تھا۔ چھپانے کی کتنی بے حد کوشش کی۔ میں نے اپنے خط میں اپنی تباہ شدہ زندگی کی مفصل کہانی لکھ دی تھی۔ مگر انہوں نے کسی سے اس کا ذکر تک نہیں کیا۔ بلکہ بیوی کے یکایک گومتی میں ڈوب کر مر جانے کی خبر کی ہی تائید کی۔ کتنی عظیم ہے اس اعلےٰ ہستی کی روح! اگر میں ایک مرتبہ اس کو پھر پا لیتی تو اس کے قدموں پر اپنی پیشانی رکھ کر کہتی!" دیوتا! میری اس ایک غلطی کو معاف کر دو"! انسان سے غلطی ہو جایا کرتی ہے میں نے ایک غلطی کی اس کے کفارہ کے طور پہ آج اتنے دنوں سے میں ایک بدقسمت بیوہ کی مانند زندگی گذار رہی ہوں۔ صبح صادق میں سنہری شعاعوں کی طرح مسکراہٹ بکھیرتا ہوا وفد جب مسکراتا ہوا اُن کی گود میں بیٹھ جائیگا۔ تو میرا یقین ہے کہ وہ میری اس گناہ کی کمائی کو بھی

اپنی رحمدلی سے قبول کرنے کی کوشش کریں گے۔ مگر اب انہیں تلاش کروں تو کہاں اگر اپنے دیوتا کو پا جاؤں تو......

اس طرح انہیں خیالات پر غور کرتے کرتے ایک مرتبہ جی گھبرا گیا۔ میں نے ونود کو آواز دی۔ وہ بندوق لئے ہوئے فوجی کو ایک ہاتھ میں اُٹھائے۔ اور خود ایک دو ایک دو کہتا ہوا آکر میری گود میں بیٹھ گیا۔ اس کی بھولی شکل دیکھ کر نہ جانے مجھے کیوں اپنا لڑکپن یاد آ گیا۔ مجھے جان پڑا جیسے ونود کے ساتھ ہی میرا لڑکپن میرے ساتھ اٹکھیلیاں کرنے کے لئے آ گیا ہے۔ مجھے یاد آیا اپنے صحن کا وہ نیم کا درخت جس کے نیچے بیٹھ کر میں اپنی چھوٹی بہن رجنی کے ساتھ روٹی کے لقمے بن بن کر کھایا کرتی تھی۔ مجھے یاد آ گیا گڑیوں کا وہ کھیل جس میں دولہا کی ماں بنی تھی۔ اور رجنی دلہن کی۔ پھر یاد آیا جیسے تعلیم حاصل کر میں شادی کے قابل ہوئی ہوں سکول کی وہ سڑکیں یاد آئیں جن پر سے گزر کر میں سکول جایا کرتی تھی۔ وہ سڑکیں اب بھی ویسی ہی بنی ہوں گی۔ اب بھی سکول جانے والی لڑکیاں ان پر چلتی ہونگی۔ اب بھی سکول کے باہر لوگ اپنی بہن بیٹیوں کو لے جانے کے لئے آتے ہوں گے۔ مگر بدقسمت پریا کے لئے اب وہ مقامات بھی خواب کی چیزیں بن گئے ہیں۔

میں بھول جاتی اپنی تمام تکالیف کو! ونود میرے دامن کا داغ ہے۔ یہ بات کبھی خواب میں بھی میرے دل میں نہیں آئی۔ حاملہ ہونے پر میں نے حتی المقدور حمل گرانے کی کوشش کی۔ مگر اب ونود کے سر میں ذرا سا درد ہونے پر بھی میں رات رات بھر اس کے پاس بیٹھی جاگتی رہتی ہوں۔

بچپن کتنا راحت پذیر۔ کتنا دلفریب۔ کتنا نشہ آور ہے۔ کاش کسی طرح ونود کی طرح مجھے بھی اپنا بچپن واپس مل جاتا۔ آہ!

ﮯ "کہاں گیا لڑکپن میرا اضراب کر کے مجھے"

فلمی دُنیا کی جانب

تھیٹریکل دنیا بھی رقاصاؤں کی دنیا سے ملتی جلتی ہے۔ اس کا باعث یہی ہے
کہ اس میں کام کرنے والی زیادہ تر ایکٹرسیں رقاصہ ہوتی ہیں معزز گھرانے کی لڑکیوں کو
سٹیج پر لانے کے لئے کچھ ہنر کی دہائی دینے والے اشخاص کافی شور مچا رہے ہیں مگر جبتک
تھیٹر میں اصلاح نہیں ہو جاتی۔ معزز گھرانے کی لڑکیاں سٹیج پر کیسے آسکتی
ہیں۔ کسی لڑکی کے سٹیج پر آتے ہی۔ امیروں کے لاڈلے لال انہیں اپنے چنگل میں
پھنسانے کے لئے زمین آسمان کے قلابے ملانے لگتے ہیں طرح طرح کے لالچ انہیں
دیئے جاتے ہیں۔ ان کو دام فریب میں پھنسانے کیلئے طرح طرح کے جال بچھائے جاتے ہیں
پھر کوئی شریف آدمی بہو بیٹیوں کو کیوں تھیٹریکل کمپنیوں میں جانے دینگے ؟ کچھ سال پہلے
کی بات ہے۔ کچھ سناتن دھرمیوں نے اس بات پر اعتراض کیا تھا۔ کہ سیتا ساوتری وغیرہ
کا پارٹ رقاصاؤں کو نہ کرنے دیا جائے مگر معزز گھرانے کی لڑکیاں آئیں تو کیسے !

نواب صاحب اس دن میرے یہاں سے بھناتے چلے گئے تھے اس لئے مجھے اب
خوف ہونے لگا تھا۔ کہ وہ کچھ نہ کچھ گل ضرور کھلائینگے اور ہوا بھی ایسا ہی میں نے
سنا سیٹھ لکشمی نارائن اور ان میں کمپنی کی فروختگی کی بات چل رہی تھی سیٹھ
صاحب اسی ہزار مانگ رہے ہیں۔ اور نواب صاحب ستر ہزار دے رہے ہیں بسوا
صرف دس ہزار پر اڑکا ہوا ہے۔ میں نے سمجھ لیا کہ مجھے نیچا دکھانے کیلئے ہی یہ سب کچھ
کیا جا رہا ہے۔ میں نے ارادہ کر لیا کہ اگر کمپنی نواب صاحب کے اختیار میں چلی جائے گی
تو میں ہرگز کمپنی میں نہ رہونگی۔ اب یہ فکر دامنگیر ہوئی کہ اگر اس کمپنی کو چھوڑ دیا

تو پھر کہیں نہ کہیں کام تو کرنا ہی پڑے گا۔ اس لئے پہلے سے ہی کوئی ملازمت کیوں نہ تلاش کروں۔ مرزا صاحب کبھی کبھی میرے یہاں آتے تھے۔ میں نے تمام قصہ انکے گوش گذار کیا۔ اور یہ بھی صاف طور سے کہہ دیا کہ اگر نواب صاحب نے کمپنی خرید لی تو میں اسی دن نوکری چھوڑ دونگی۔ مرزا صاحب نے دوڑ دھوپ کرکے اپنی فلم کمپنی کے مینجنگ ڈائرکٹر سے میرا تعارف کرا دیا۔ وہ بھی مجھ سے واقف تھے میرے پارٹ کو دو چار مرتبہ دیکھ چکے تھے۔ اس لئے انہوں نے مجھے لے لینے کا یقین دلایا۔ سب باتیں طے ہوگئیں۔ جب کمپنی کی طرف سے مجھے تقرری کا خط مل گیا۔ تو میں بیفکر ہوگئی۔

آخر کار نواب صاحب نے اسی ہزار روپیہ میں تھیٹریکل کمپنی خرید لی۔ اس کی باقاعدہ رجسٹری ہوگئی۔ نواب صاحب اپنی اس فتح پر پھولے نہ سماتے تھے۔ رجسٹری ہوجانے پر جس دن وہ تھیٹر میں آئے۔ اس دن ان کا رعب دیکھنے کے قابل تھا۔ اس طرح اکڑ اکڑ کر چل رہے تھے۔ جیسے شاید کسی مقام کو فتح کرکے واپس آئے ہوں۔ بورڈ پر اطلاع چسپاں کر دی گئی۔ یکم اپریل سے کمپنی کے چلانے کی ذمہ واری نواب صاحب نے لے لی ہے۔ اس کے لین دین۔ نوکروں کی تنخواہ۔ ہاؤس کا کرایہ اور سین سینری سبکی ذمہ واری انہیں پر رہے گی۔ اس مطلب کی اطلاع اخبارات میں شایع کر دی گئی۔ نواب صاحب کے مصاحب میاں جلیل نے ۲۵ مارچ کی شام کو مجھے تھیٹر کے ونگ میں جب جھک کر سلام کیا تو مجھے ہنسی آگئی۔ ان کی سلام کا مطلب تھا کہ اب یکم اپریل سے آپ سیٹھ لکھشمی نارائن کی کمپنی میں ملازم نہیں بلکہ نواب صاحب کی کمپنی میں ملازم ہیں۔ اور میرے ہنسنے کا مطلب تھا۔ کہ میں اس سے پہلے ہی ملازمت چھوڑ رہی ہوں۔

سیٹھ لکھشمی نراین نے یکمشت دو روپیہ پانے کے لالچ سے کمپنی نواب صاحب کے

ہاتھوں فروخت کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ درحقیقت میرے آنے کے بعد کمپنی کو کسی طرح کا گھاٹا نہیں تھا۔ سیتا کا ڈرامہ کافی مشہور ہو چکا تھا۔ ۲۰ مارچ کو سیٹھ لکھشمی نرائن کو میں نے اپنے یہاں بلایا۔ ہم دونوں میں اسطرح باتیں ہوئیں۔

"سیٹھ صاحب میں آپ کی احسانمند ہوں۔ آپ نے کلکتہ کی پبلک کے سامنے میرا نام لاکر رکھا۔ مجھے فن تھیٹر سے آگاہ کر دیا۔ مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں لیکن اب میں آپ کی کمپنی میں کام نہیں کرنا چاہتی"

کیوں! کیوں! سیٹھ صاحب نے حیران ہو کر پوچھا۔ نواب صاحب تو بہت اچھے آدمی ہیں۔ مجھ سے زیادہ پیسے والے ہیں۔ تنخواہ میں ایک دن کی بھی دیر نہ ہوگی۔ اور اگر آپ کمپنی میں نہ رہینگی تو کمپنی میں رہ ہی کیا جائے گا۔ آپکے لئے تو نواب صاحب کمپنی خرید رہے ہیں۔

میں اچھی طرح جانتی تھی کہ مجھے نیچا دکھانے کے لئے ہی یہ سب کیا جا رہا ہے مگر سیٹھ صاحب کی بات سے میرا خیال اور بھی پختہ ہو گیا۔ اب اس بات میں کچھ شک باقی نہیں رہا کہ کمپنی خریدنے کا جال مجھے پھنسانے کے لئے ہی بچھایا جا رہا ہے سیٹھ لکھشمی نارائن پیسے والے ضرور تھے۔ مگر شاید جس وقت ایشور کے یہاں عقل تقسیم ہو رہی تھی وہ وہاں نہیں تھے۔ اس لئے نواب صاحب کے فریب میں آگئے میں نے کہا "سیٹھ صاحب! اب میں کسی بھی تھیٹریکل کمپنی میں کام نہیں کرنا چاہتی۔ دیارام چاچا کا ارشاد ہے کہ نواب صاحب کی کمپنی میں کام نہیں کرنا چاہیئے۔ چاچا صاحب کی رائے کے خلاف میں کچھ کر نہیں سکتی۔ اس لئے ۲۹ مارچ سے میرا آپ استعفیٰ منظور کرلیں۔

"مگر مگر ہاں! نواب صاحب تو آپ ہی کی وجہ سے کمپنی خرید رہے ہیں۔ وہ کہا

آپ کا استعفےٰ منظور کرلیں گے۔؟"

"میں نواب صاحب کو نہیں جانتی! میں ابھی تک آپ کی کمپنی میں ملازم ہوں جب آپ کمپنی سے اپنا تعلق چھوڑ رہے ہیں اور اب آپ کمپنی کے مالک نہیں رہے تو میرا آپ کا معاہدہ ختم ہوجاتا ہے۔ آپکو میرا استعفےٰ منظور کرنا ہی پڑیگا۔

مجھے تو کوئی اعتراض نہیں ہے۔ اگر کمپنی میرے ہاتھ میں رہتی تو میں آپکو ہرگز الگ نہ ہونے دیتا مگر اب تو کمپنی نواب صاحب کے ہاتھ جاچکی ہے اگر میں یہ جانتا کہ میرے الگ ہوتے ہی آپ بھی الگ ہوجائینگی تو میں اس وقت ہرگز کمپنی نہ فروخت کرتا۔ اب تو مجھے گھاٹا بھی نہ تھا۔ یہ تو بہت بُرا ہوا۔

بُرا کچھ بھی نہیں ہوا۔ ایشور جو کرتا ہے ٹھیک ہی کرتا ہے مجھے آپکی طرف سے کچھ بھی شکایت نہیں ہے۔ آپ کے سلوک سے میں بہت خوش ہوں۔ مجھے آپ سے کوئی گلہ نہیں۔

بس صاحب یہی مجھے اطمینان ہے۔ روپیہ پیسہ خرچ ہوتا ہی رہتا ہے۔ مگر کسی کو کوئی شکایت نہ ہونی چاہیئے۔ آپ خوش ہیں اس سے مجھے اطمینان ہے آپ اگر کام کرنا ہی نہیں چاہتیں تو دوسری بات ہے۔ ویسے آپکے سب طرح کے اطمینان کا ذمہ میں لیتا ہوں۔

بے اطمینانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ اب میں سٹیج پر کام ہی نہیں کرنا چاہتی میرا ارادہ اب فلم کمپنی میں جانے کا ہے۔

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ اس میں ترقی کی کافی گنجائش ہے۔ تھیٹر میں جہاں آپ صرف کلکتہ کی پبلک کی توجہ اپنے پارٹ کی طرف کھینچ سکتی ہیں وہاں فلم میں کام کرنے سے آپ کا نام ایک ہی فلم سے ہندوستان بھر میں پھیل سکتا ہے اس کے لئے اگر کہیں میری مدد کی ضرورت پڑے تو کہئے گا۔ میں تیار ہوں۔

آپ کو اس کے لئے میں تکلیف نہ دوں گی۔ میں نے سب انتظام کر لیا ہے۔ میں ملازم بھی ہو گئی ہوں۔

یہ کہہ کر میں نے تقرری کا خط سیٹھ صاحب کو دکھلایا۔ اِدھر اُدھر کی بہت سی باتیں ہونے کے بعد سیٹھ صاحب چلے گئے۔ میں اپنی زندگی کے اس نئے باب پر غور کرنے لگی۔

ملاپ

سیٹھ لکشمی نرائن سے جب نواب صاحب نے سنا تھیٹریکل کمپنی سے استعفےٰ دے دیا ہے۔ تو ان کی حیرت کا ٹھکانا نہ رہا۔ تھیٹر میں کام کرنے والی کئی ایکٹرسوں نے میرے پاس آکر اس بات کے لئے عاجزانہ درخواست کی اور سمجھایا کہ کمپنی کو نہ چھوڑوں۔ مگر میں ارادہ کر چکی تھی۔ میں کسی طرح بھی کمپنی میں کام کرنے کے لئے تیار نہ ہوئی۔ تو مجبور ہو کر سیٹھ صاحب کو میرا استعفےٰ منظور کرنا پڑا اخبارات میں اشتہار شایع کیا گیا۔ کہ اگر آپ مس ملا کے پارٹ کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ تو ۲۵ تاریخ کو یاد رکھئے۔ شاید پھر آپ کو یہ سنہری موقعہ نصیب ہو یا نہ ہو تمام کلکتہ کے شائقین تھیٹر کو میرے استعفے کی خبر مل گئی۔ بعض لوگوں نے کوشش کی کہ میں اپنی کمپنی قائم کروں اور بعض نئی کمپنی بنا کر مجھے اپنے یہاں ملازم رکھنے کے لئے تیار ہو گئے۔ مگر میں نے ان دونوں تجاویز کو ٹھکرا دیا۔ میں فلم کمپنی میں جانے کا ارادہ کر چکی تھی۔ میں دیگر نازنینوں کی طرح بقول مرزا صاحب سنہری پردے پر چم چمانا چاہتی تھی۔

فلم ٹیکنگ پر اس دوران میں میں نے کئی کتب کا مطالعہ کیا۔ فلمیں دیکھنے کا شوق تو مجھے پہلے سے ہی تھا مگر کلکتہ کی نئی زندگی نے بنگالی فلمیں دیکھنے کی طرف میری توجہ اور زیادہ منعطف کی۔ "دیوداس" جیسی پُرسوز اور سبق آموز فلمیں ہی مجھے پسند آتی تھیں۔

بنگالی زبان میں پُرسوز نیز سبق آموز فلموں کو سب سے پہلے جگہ دی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ دل کے اندرونی حصے تک اپنا اثر دکھاتی ہیں۔ بنگالی

فلموں کو دیکھ کر مجھے بہت اطمینان حاصل ہوتا تھا۔ یہ ناستہ" اور وشش برکمش" زہریلا درخت) میرے لوح دل پر ایک نہ مٹنے والا نقش چھوڑ گئے۔ گرہ واہ، کے واقعات ایسے تھے جس میں مجھے جان پڑا جیسے کوئی امیر اور غریب کبھی بھی ہموار زمین پر ایک ساتھ کھڑے نہیں ہو سکتے۔ امیروں کا رعب۔ ان کی عیش و نشاط کی زندگی غریبوں کو اطمینان سے زندگی بسر کرنے کی بھی سہولت عطا نہیں کرتی۔

دیکھتے دیکھتے وہ دن آ گیا جس دن میں نے تھیٹریکل دنیا کو چھوڑ کر فلمی دنیا میں داخل ہونے کا ارادہ کیا تھا۔ اس دن ہاؤس ٹھساٹھس بھرا ہوا تھا۔ تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ نواب صاحب اور ان کے مصاحب بھی میوزک چیئروں کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ نہ جانے کیوں مجھے اُس دن کچھ بُرا سا معلوم دے رہا تھا۔ میں اپنے دل کو بہت سمجھاتی۔ کہ دنیا تغیر پذیر ہے۔ دنیا کی ہر ایک چیز تبدیلی چاہتی ہے۔ یہ زندگی بھی تو ایک سٹیج ہی ہے اس لئے تھیٹریکل کمپنی چھوڑنے کے وقت مجھے رنج نہ کرنا چاہیئے۔ مگر دل میں ایسا درد سا ہو رہا تھا جو الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔

مقررہ وقت پر ناٹک شروع ہوا۔ رام کے دربار میں لنکا کے فاتح بہادر رام کی سیتا نے راحت و سرور عیش و نشاط کا ایک دن دیکھا۔ اس کے بعد ایک دھوبی کے کہنے پر رام نے سیتا کو سنسان جنگل میں لکشمن کو چھوڑ دینے کا حکم دیا۔ اس کے بعد سیتا بن میں تھی۔ لکشمن نے رو رو کر سیتا کے بن باس کی خبر سیتا کے گوش گذار کی۔ اس کے بعد وہ چلے گئے۔ سیتا کو بالمیک کے پاکیزہ آشرم میں جگہ ملی۔ اس کے بعد نظارہ میں لو اور کُش کو تعلیم دیتے ہوئے بالمیک دکھلائے گئے تھے۔ بچے ضد کر کے اپنے باپ کا نام جاننے کے لئے اصرار کر رہے تھے۔ مگر اُن کی خواہش جوں کی توں رہنے دی گئی۔ اس نظارہ

کے بعد جنگل میں فرقت زدہ سیتا کو دکھلایا گیا تھا۔ سیتا نے کہا یہ وہ بھی بن باس تھا۔ مگر آج کے بن باس اور اس بن باس میں فرق ہے۔ اُس بن باس کے وقت میرے رام میرے پاس تھے مگر یہاں ان کے نام کی یاد مجھے زندہ بنائے ہوئے ہے۔ جنگل کے خوشبودار پودوں سے اس وقت پھول چن کر میں مالا بنایا کرتی تھی۔ اس مالا کو بھگوان رام کے گلے میں ڈال کر میں خوشی سے جامے میں پھولی نہ سماتی اور اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھتی تھی۔ مگر بکھرے ہوئے پھولوں کو لے کر کیا کرے؟ پھولوں کو چن کر اگر پھولوں کا ہار بنا بھی لے تو اس کے رام کہاں ہیں جن کے پاکیزہ قدموں پہ یہ ہار چڑھا دے۔

میں سیتا کا پارٹ ادا کر رہی تھی۔ مجھے اپنی زندگی یاد ہو آئی۔ بدقسمت پریما کو اپنی زندگی کے گذشتہ واقعات یاد آ گئے۔ ساتھ ہی ساتھ یاد آئی اپنی زندگی کی دولت اس لاثانی ہستی کی جس کے ساتھ اس نے دھوکا کیا تھا۔ میں بھول گئی کہ ہزاروں سامعین میرا پارٹ دیکھنے کے لئے جمع ہوئے ہیں ایک لمحہ کے لئے بھول گئی کہ میں پریما نہیں بملا نہیں ——— بلکہ فرقت زدہ سیتا ہوں۔ ونگ میں کھڑا ہوا میرا ونود میرے پاس آنے کی کوشش کر رہا تھا۔ دیارام چاچا اسے بہلانے کی کوشش کر رہے تھے۔ جب پرڈمپٹر نے سیٹی بجا کر میری توجہ اپنی طرف منعطف کرائی تو میری توجہ ونود اور اپنے خیالات کی جانب سے دور ہو کر پھر سٹیج پر آ گئی۔ میں نے کچھ پھول چنے اور اور اس موقع کے لئے بنایا ہوا گانا اپنے دل کے تمام خیالات برطرف کر کے گایا۔

بیلہ پھولے آدھی رات
کس کے گلے میں ڈاروں

پھولن کے شبھ ہار
بیلہ پھولے آدھی رات

گانے کا سماں بندھ گیا۔ تالیوں کی گڑگڑاہٹ سے ہال گونج اٹھا۔ پھولوں کی ٹوکری کے پھولوں کو ہاتھ سے اوپر اچھالتے ہوئے میں نے مندرجہ بالا گانا دوہرایا! بھگوان رام سیتا کی اس دردانگیز زندگی کا کب خاتمہ ہوگا۔ تمہاری فرقت میں سیتا کی زندگی ایک بوجھ ہوگئی ہے۔ تمہاری نشانی کسی طرح اگر میں تمہارے سپرد کرنے کے قابل ہوسکتی تو یہ بدقسمت سیتا کب کی اس فانی دنیا سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہوگئی ہوتی بدقسمت سیتا کے رام تم کہاں ہو؟

میرے ان الفاظ کو سُنکر سامعین بحرِ غم میں ڈوب گئے۔ میرے ان پُرسوز الفاظ نے ان کے دل پر گہرا اثر کیا۔ اتنے میں ہجوم میں سے کسی نے کہا "پریا! میں آگیا۔ میں آگیا" اس کے ایک لمحہ بعد ہی میں نے دیکھا کہ چھلانگ مار کر کوئی سٹیج پر چڑھ آیا۔ اس نے پھر کہا " پریا! میں آگیا۔ تم نے مجھے سمجھنے میں بھول کی ہیں...... میں..... ۔ پریا!! "

مجھے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ آتا تھا میرے رام میری آنکھوں کے سامنے تھے تھیٹر میں شور وغل مچ گیا۔ مارو۔ نکالو کی آواز سے ہال گونج اٹھا۔ ڈراپ ڈال دیا گیا۔ وہ میرے اور بھی نزدیک آکر بولے " پریا! تم نے مجھ سے پہلے کیوں نہیں کہا۔ میں نے تمہیں معاف کر دیا۔ پریا! میں آگیا "

"میں میں پریا نہیں بھلا ہوں۔ میرا دنیا میں کوئی نہیں۔ میرا کوئی نہیں۔ میرا کوئی نہیں۔ تم کون ہو؟ میرا دنو۔ میرا بچہ۔ میرا لاڈلا" میں نے دوڑ کر بچے کو گود میں اٹھا لیا۔ لوگ یہ سب کچھ حیرت سے دیکھ رہے تھے

باہر خوب شور و غل ہو رہا تھا۔ انہوں نے بچے کو میرے ہاتھوں سے چھینتے ہوئے کہا "پریما! میں نے تمہیں معاف کر دیا۔ تم کسی طرح کا بھرم نہ رکھو۔ اب میں آ گیا۔"

میرا سر چکر کھا رہا تھا۔ دنیا میری آنکھوں کے سامنے گھوم رہی تھی۔ میں دھڑام سے گر پڑی۔ ان کا ایک ہاتھ میرے سر پر تھا۔ اور دیا رام چاچا میرے پاس کھڑے تھے۔ باہر شور و غل ہو رہا تھا "مارو۔ نکالو۔ بدمعاش ہے" منیجر نے پوچھا یہ کون ہے۔ میں نے کہا "یہی تو میرے پران پتی ہیں۔"

اس کے بعد میں ان کی آغوش میں ہی بیہوش ہو گئی۔

ختم شُد